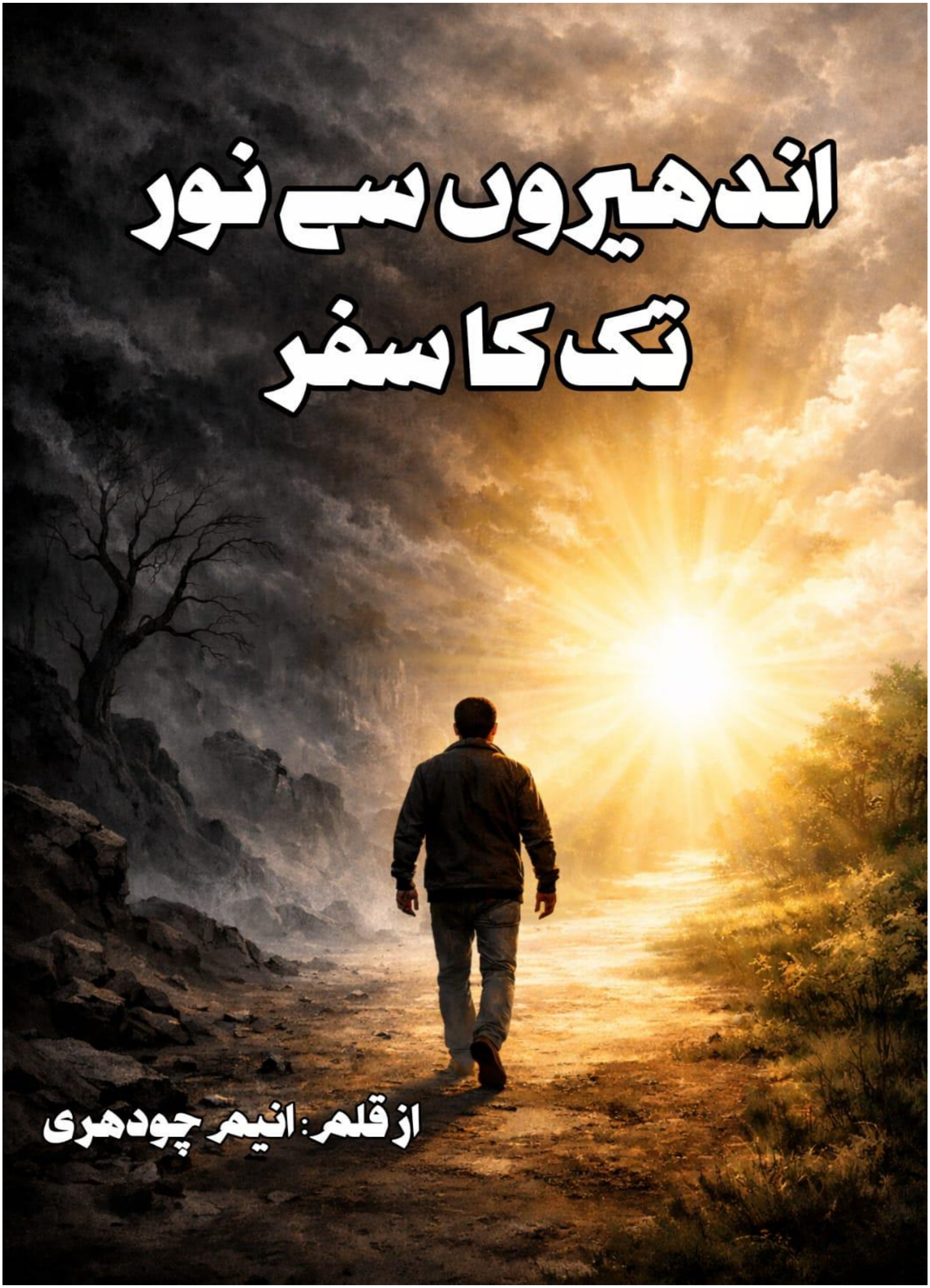

اندھیروں سے نور
تک کا سفر
از قلم: انیم چودھری

(-سرورق کا تصور)

ایک مکمل سیاہ پس منظر، جس میں بارش کی لکیریں ہیں۔ مرکز میں، ایک پرانے جائے نماز پر ایک شخص گہرے سجدے میں گرا ہوا ہے۔ اس کی پیشانی کے نیچے، زمین پر ایک اکیلا، روشن آنسو (موتی کی طرح چمک رہا ہے، جس سے نور کی ایک کانپتی ہوئی لکیر اوپر عنوان کی طرف اٹھ رہی ہے۔

اندھیروں سے نور تک کا سفر

تحریر

انیم چودھری

انتساب

...اس ہر روح کے نام

،جو اندھیروں میں بھٹک کر

نور کی متلاشی ہے۔

فہرست

اندھیروں سے نور تک کا سفر (انیم چودھری)

حصہ اول: معصومیت کی پہلی کرن

باب 1: دادی اماں کا جائے نماز

سمیر کی یادداشت کی سب سے پہلی اور سب سے گہری خوشبو، کسی پھول، مٹی یا بارش کی نہیں تھی، بلکہ وہ اس کی دادی اماں کے پرانے، مخملی جائے نماز کی خوشبو تھی۔ ایک ایسی مہک جو عطرِ حنا، بزرگوں کے پاکیزہ لمس اور ان گنت سجدوں کے نور سے مل کر بنی تھی۔ وہ جائے نماز، سمیر کے لیے صرف ایک کپڑے کا ٹکڑا نہیں تھا، بلکہ اس کی چھ سالہ زندگی کی سب سے پر سکون پناہ گاہ اور سب سے بڑی کائنات تھی۔

گاؤں کے اس پرانے کچے گھر میں، جہاں دیواروں پر سفیدی کی جگہ وقت نے اپنی کہانیاں لکھ دی تھیں، ایک چھوٹا سا کمرہ دادی اماں کا تھا۔ اس کمرے میں سورج کی پہلی کرن ایک چھوٹی سی کھڑکی سے چھن کر آتی اور سیدھا اس جگہ پڑتی جہاں دادی اماں کا جائے نماز بچھا ہوتا۔ سمیر کو یاد تھا، جب فجر کی اذان کی مدھم آواز گلیوں میں گونجتی، تو گھر میں ایک لطیف سی سرسراہٹ ہوتی۔ یہ اس کی دادی کے اٹھنے کی آہٹ تھی۔

وہ اٹھتیں، لکڑی کے لوٹے سے وضو کرتیں، اور جب اپنے سفید دوپٹے، جو ان کے نورانی چہرے کے گرد ایک ہالہ بنائے رکھتا تھا، کو اوڑھ کر جائے نماز پر کھڑی ہوتیں، تو سمیر کو لگتا جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ زمین پر اتر آیا ہے۔ وہ چپکے سے بستر سے نکلتا اور دبے پاؤں آکر، جائے نماز کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا۔

اسے نماز کے الفاظ تو نہیں آتے تھے، مگر وہ اپنی دادی کے ہر عمل کی نقل کرتا۔ جب وہ رکوع میں جاتیں، تو وہ بھی اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک جاتا۔ جب وہ سجدے میں سر رکھتیں، تو وہ بھی اپنا ننھا سا ماتھا ٹھنڈے فرش پر ٹکا دیتا۔ سجدے میں اسے جائے نماز کی وہ مسحور کن خوشبو اپنے نتھنوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی، اور اسے لگتا جیسے وہ دنیا کی محفوظ ترین جگہ پر آگیا ہے۔

اس کی دادی کی نماز لمبی اور پر سکون ہوتی۔ ان کے ہونٹوں پر مسلسل ایک زیرِ لب دعا یا ذکر جاری رہتا، جیسے وہ کسی سے راز و نیاز کی باتیں کر رہی ہوں۔ سمیر ان کے چہرے کو تکتا رہتا، جس پر ایک عجیب سا سکون اور اطمینان طاری ہوتا۔

،ایک دن جب وہ نماز پڑھ چکیں اور اپنی میلی سی تسبیح پر کچھ پڑھنے لگیں، تو سمیر نے ہمت کر کے جائے نماز کی مخمل پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا

"دادی اماں، یہ اتنا نرم اور خوشبودار کیوں ہے؟"

دادی اماں نے تسبیح روک لی، اپنا چشمہ ناک پر ٹکایا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شفقت کے لاکھوں دیئے جل اٹھے۔

انہوں نے سمیر کا ہاتھ اپنے جھریوں بھرے، گرم ہاتھ میں لے لیا اور بولیں

"میرے بچے، کیونکہ یہ اللہ سے بات کرنے کی جگہ ہے۔جب ہم اپنے سب سے پیارے رب کے سامنے سر جھکاتے ہیں، تو وہ اس جگہ کو اپنی رحمت کی خوشبو سے بھر دیتا ہے۔"

پھر انہوں نے اسے اپنی گود میں کھینچ لیا، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور اپنی آنکھیں بند کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

ان کی آواز کسی گہری وادی سے آتی ہوئی سر گوشی کی مانند تھی

...یااللہ! میرے اس بچے کے دل کو ہمیشہ اپنے نور سے روشن رکھنا۔اسے کبھی اندھیروں میں بھٹکنے نہ دینا۔اس کے ماتھے کو اپنے سجدوں کی لذت سے آشنا کر دے مولا"

"آمین۔

سمیر ان کی گود میں آنکھیں موندے لیٹا رہا۔

اسے دعا کے الفاظ تو پوری طرح سمجھ نہیں آئے، مگر اس دن، اس کی روح نے "نور"، "سجدے" اور "اللہ" کے الفاظ کو اپنے اندر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

یہ محض ایک یاد نہیں تھی

یہ اس کی روح کی بنیاد تھی

وہ پہلا بیج تھا جو اس کے دل کی زمین میں بویا گیا تھا۔

یہ وہ خوشبو تھی جسے برسوں بعد، شہر کے شور، گناہوں کی بدبو اور روح کی گھٹن کے درمیان، اسے واپس اپنے گھر کا راستہ دکھانا تھا۔

....

باب 2: آسمان میں اللہ کا گھر

، گاؤں کی گرم دوپہریں سست اور پرسکون ہوتی تھیں۔جب سورج کی تپش سے آنگن کی مٹی مہکنے لگتی، پرندے نیم کے گھنے درخت پر سستانے لگتے اور گھر کے بڑے قیلولہ کرتے تب سمیر کی شرارتوں کا وقت شروع ہوتا۔

مگر اس دن، اس کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل تھی، ایک سوال جو اس کے ننھے سے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا۔

وہ آنگن میں بیٹھا مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہا تھا، مگر اس کی نظریں بار بار اوپر اٹھتیں، اس وسیع، گہرے اور بے انتہا نیلے آسمان کی طرف، جس پر سفید بادلوں کے ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح تیر رہے تھے۔اسے اپنی دادی کی صبح والی بات یاد تھی۔

"اللہ سے بات کرنے کی جگہ۔"

اس نے مٹی کے کھلونے وہیں چھوڑے اور بھاگتا ہوا اس چارپائی کے پاس گیا جہاں اس کی دادی اماں آنکھیں موندے لیٹی تھیں، مگر ان کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔

،اس نے دادی کے گھٹنے پر سر رکھا اور اپنی سب سے معصوم آواز میں پوچھا

"دادی اماں، کیا اللہ میاں کا گھر وہ اوپر نیلے آسمان میں ہے؟"

دادی اماں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ ان کے چہرے پر تھکن نہیں، بلکہ ایک میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔

انہوں نے اسے اپنے پاس چارپائی پر بٹھالیا اور اس کے گال کو نرمی سے سہلاتے ہوئے بولیں

"میرے چاند، تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟"

سمیر نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا

"کیونکہ وہ سب سے اونچی اور سب سے بڑی جگہ ہے۔ اور آپ کہتی ہیں ناں، اللہ سب سے بڑا ہے۔"

دادی اماں کا چہرہ ایک لمحے کے لیے تمتما اٹھا۔ اپنے چھ سالہ پوتے کے منہ سے ایسی گہری بات سن کر ان کا دل بھر آیا۔

،انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر سمیر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں

"تم ٹھیک کہتے ہو، اللہ سب سے بڑا ہے، اتنا بڑا کہ یہ آسمان اور یہ زمینیں، سب اس کے سامنے ایک ذرے کی مانند ہیں۔ لیکن اس کا کوئی ایک گھر نہیں ہے۔ وہ تو ہر جگہ ہے۔"

، سمیر کی چھوٹی سی عقل اس بات پر الجھ گئی۔ اس نے حیرت سے کہا

"ہر جگہ؟ یہاں بھی؟ اس کمرے میں؟"

دادی اماں نے پیار سے اس کی ناک کھینچی اور بولیں

"ہاں میرے بچے، یہاں بھی۔"

پھر انہوں نے ایک مثال دی جو سمیر کے دل میں اتر گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ، سورج کہاں ہے؟"

سمیر نے فوراً آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ رہا۔"

"شاباش۔" دادی بولیں۔

مگر اس کی روشنی کہاں ہے؟" انہوں نے سمیر کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا"

"کیا اس کی روشنی اور گرمی تمہارے اس ہاتھ پر نہیں ہے؟ کیا وہ آنگن کی اس مٹی پر نہیں ہے؟ کیا وہ اس نیم کے پتے پر نہیں ہے؟"

سمیر نے غور سے اپنا ہاتھ دیکھا، جس پر سورج کی سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

،دادی نے اپنی بات جاری رکھی

"بالکل اسی طرح، میرا اللہ عرش پر ہے، لیکن اس کی رحمت، اس کی محبت اور اس کا نور کائنات کے ہر ذرے میں ہے۔ وہ تمہاری سانسوں سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

پھر انہوں نے اپنی آواز کو اور بھی دھیما کر لیا، جیسے کوئی بہت گہرا راز بتا رہی ہوں۔

"اچھا یہ بتاؤ، دادی کی محبت تمہارے لیے کہاں ہے؟"

سمیر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا، پھر اس نے دادی کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دادی مسکرائیں

"ہاں، یہاں ہے۔ مگر کیا تم اسے دیکھ سکتے ہو؟ کیا تم اسے چھو سکتے ہو؟ نہیں ناں... مگر تم اسے محسوس کر سکتے ہو۔ ہر وقت۔"

انہوں نے سمیر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

بالکل اسی طرح، اللہ ہمیں نظر نہیں آتا، مگر اس کی محبت ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس ہوا میں، اس پانی میں، میری محبت میں، تمہارے دل کی دھڑکن میں... ہر جگہ صرف وہی تو ہے۔"

اس دن، سمیر کو اپنے سوال کا کوئی کتابی جواب نہیں ملا، مگر اسے ایک ایسا احساس مل گیا تھا جو ہزار کتابوں پر بھاری تھا۔

اسے لگا کہ اللہ میاں صرف آسمان میں رہنے والے کوئی بادشاہ نہیں، بلکہ وہ اس کے بہت، بہت قریب ہیں... بالکل اس کی دادی کی محبت کی طرح، جسے دیکھا نہیں جا سکتا، مگر جسکے بغیر جیا بھی نہیں جا سکتا۔

وہ سر دادی کی گود میں رکھے، نیم کے پتوں سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کو دیکھتے ہوئے، اسی محبت اور اسی سکون کے احساس میں ڈوبتا چلا گیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی اسے اس احساس سے بہت دور، ایک ایسے طوفان میں لے جانے والی ہے جہاں نہ تو یہ سکون ہوگا اور نہ ہی یہ محبت

حصہ دوم: جوانی کا طوفان

باب 3: رگوں سے کھنچتی ہوئی جڑیں

وہ صبح قیامت کی صبح تھی۔ آسمان پر سورج نہیں، جدائی کا الاؤ روشن تھا۔ سمیر کے گاؤں کی ہر گلی، ہر درخت، ہر چہرہ آج اسے الوداع کہنے آیا تھا۔ مگر یہ الوداعی نہیں تھی، یہ اس کی روح کے ایک حصے کا ماتم تھا۔ جب اس نے آخری بار دادی اماں کے جھریوں بھرے ہاتھوں کو چھوا، تو اسے لگا جیسے وہ اپنی زندگی کی سب سے مضبوط جڑ کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہا ہے۔

دادی اماں کچھ بول نہیں رہی تھیں۔ ان کی آواز آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب چکی تھی۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے صندوق کھولا اور اپنا وہ پرانا، بوسیدہ جائے نماز نکالا، جس کی مخمل پر ان کے لاکھوں سجدوں کے نشان ثبت تھے۔ انہوں نے وہ جائے نماز نہیں، اپنی روح کا ایک ٹکڑا سمیر کے ہاتھ میں تھمایا اور اپنی زخمی آواز میں صرف اتنا کہا

"میرے بچے... جب دنیا کی چکا چوند تیری آنکھوں کو اندھا کرنے لگے... تو اس پر اپنا ماتھا رکھ دینا... یہ تجھے تیرے رب کا راستہ دکھائے گا۔"

انہوں نے اس کا ماتھا چوما، اور ان کا وہ ایک آنسو، جو شاید ان کی زندگی بھر کی دعاؤں کا نچوڑ تھا، ایک گرم موتی کی طرح سمیر کے گال پر گرا اور سیدھا اس کی روح میں جذب ہو گیا۔

ٹرین ایک لوہے کا اژدہا تھی، جو اسے اس کے جنت جیسے گاؤں سے نگل کر، ایک انجانی دنیا کی طرف لے جا رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر بھاگتا ہر منظر، اس کے دل پر ایک چرکے کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ سفر نہیں تھا، یہ اس کی جڑوں کا اپنی مٹی سے کھینچنے کا کرب ناک عمل تھا۔ اس نے اس جائے نماز کو اپنے سینے سے اس طرح چمٹا رکھا تھا، جیسے کوئی طوفان میں اپنی کشتی کے آخری تختے کو چمٹائے رکھتا ہے۔

پھر شہر آ گیا۔

اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی اسے لگا جیسے وہ شور، دھوئیں اور بے حسی کے ایک ابلتے ہوئے جہنم میں گر گیا ہے۔ ہزاروں چہروں کا ایک سیلاب تھا، مگر ہر چہرہ انجان، ہر نگاہ خالی۔ یہ وہ شہر تھا جس کے خواب اس نے دیکھے تھے، مگر آج یہ شہر ایک عفریت کی طرح اسے نگلنے کو تیار کھڑا تھا۔

ہاسٹل کا کمرہ ایک قبر کی طرح تنگ اور وحشت ناک تھا۔ رات کے اندھیرے میں، جب شہر کا شور کچھ تھما، تو اس کے اندر کی خاموشی چیخنے لگی۔ اسے اپنی دادی کا چہرہ، ان کا لمس، ان کے آنسو... سب ایک ساتھ یاد آئے۔ اس کی روح گھٹنے لگی، ایک انجانی پیاس نے اسے تڑپایا۔ یہ اس کے سجدوں کی پیاس تھی۔

اس نے ہمت کی، اور کمرے کے ایک کونے میں، لرزتے ہاتھوں سے دادی کی امانت کو بچھایا۔ جیسے ہی جائے نماز کا مخملی لمس اس کی انگلیوں سے ٹکرایا، ایک لمحے کو لگا جیسے گاؤں کی پوری مسجد اس چھوٹے سے کمرے میں سمٹ آئی ہو۔ اس نے نیت باندھی، مگر اس کے حلق سے "اللہ اکبر" کی آواز ایک سسکی بن کر نکلی۔

اسی لمحے، کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کا روم میٹ فہد اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سمیر کو سجدے کی نیت باندھے دیکھا... اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی تحقیر آمیز مسکراہٹ ابھری، جیسے اس نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ وہ مسکراہٹ نہیں تھی، وہ ایک زہر بجھا نشتر تھا جو سیدھا سمیر کی روح کی پاکیزگی کو چیر گیا۔

اپنی زندگی میں پہلی بار... پہلی بار اسے اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے پر، ایک انسان سے حیا آئی۔ اس کا وجود کانپ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس نے جس نماز کو صدیوں کی طرح طویل اور پر سکون پڑھا تھا، آج اسے چند لمحوں میں، چوروں کی طرح ادا کیا۔ وہ سجدہ، جو اس کی روح کی معراج تھا، آج اس کے ماتھے پر ایک بوجھ بن گیا تھا۔

نماز ختم ہوتے ہی، اس نے جلدی سے جائے نماز کو اس طرح تہہ کیا، جیسے کوئی اپنے سب سے قیمتی راز کو، دنیا کی نظروں سے چھپا رہا ہو۔ وہ کپڑا نہیں تھا جو تہہ ہو رہا تھا... وہ اس کا ایمان، اس کا بھروسا اور اس کی ہمت تھی، جس کی پہلی، درد بھری تہہ آج لگ چکی تھی۔ اس نے اس امانت کو بکس میں سب سے نیچے، کپڑوں کے اندھیرے میں دفن کر دیا، یہ جانے بغیر کہ وہ دراصل اپنے اندر کے نور کو دفن کر رہا ہے۔

....

باب4: پیاسی روح، ادھورا جواب

وہ ایک نگاہ... فہد کی وہ ایک حقارت بھری نگاہ، سمیر کے اندر ایک ایسا زہر چھوڑ گئی تھی جو دھیرے دھیرے اس کی روح کو نیلا کر رہا تھا۔ دن گزرتے رہے، مگر ہر دن ایک عذاب تھا۔ ہاسٹل کی محفلوں کے قہقہے، اسے اپنی تنہائی کا طعنہ دیتے، اور کلاسوں کی کتابیں، اس کے دل کے اندر اٹھنے والے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھیں۔ اس کے سینے میں ایک خلا تھا، ایک گھٹن جو بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"اس کی پیاسی روح اسے بار بار پکارتی، "کہاں ہے وہ رب، جو سانسوں سے بھی قریب تھا؟

یہ سوال ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا، جسے وہ نہ نگل سکتا تھا، نہ اگل سکتا تھا۔ آخر کار، ایک جمعہ کو اس کی بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔ اسے لگا کہ اگر آج اسے اس کا جواب نہ ملا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ وہ ایک پیاسے مسافر کی طرح، جو صحرا میں پانی کا آخری قطرہ تلاش کرتا ہے، شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد کی طرف بھاگا۔

مسجد کی عالیشان عمارت، اس کے اونچے مینار اور اس کا سنگِ مرمر کا ٹھنڈا فرش، ایک لمحے کو بھی اس کی جلتی ہوئی روح کو ٹھنڈک نہ پہنچا سکے۔ اس کے اندر کا صحرا اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اس نے وضو نہیں، اپنے آنسوؤں سے اپنے دل کو دھونے کی کوشش کی۔

مولانا صاحب کا خطبہ علم کا ایک سمندر تھا، مگر وہ سمندر سمیر کی روح کی پیاس نہ بجھا سکا۔ وہ الفاظ دماغ سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہے تھے، دل تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

، نماز ختم ہوئی، اور مولانا صاحب کے گرد عقیدت مندوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ سمیر ایک ستون کے پیچھے کھڑا، اپنے اندر کی جنگ لڑتا رہا۔ اس کا دل کہتا

"پوچھ لے... یہی آخری امید ہے۔ "اس کا دماغ کہتا، "تو ایک جاہل دیہاتی... اتنے بڑے عالم کے سامنے کیا بولے گا؟"

آخر کار، اس کی روح کی سسکی، اس کے دماغ کے خوف پر غالب آ گئی۔ جب ہجوم چھٹا، تو وہ ایک زخمی پرندے کی طرح، لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اپنی ساری ہمت جمع کر کے، کانپتی آواز میں بولا

"...حضرت...ایک...ایک عرض تھی"

"مولانا صاحب نے اپنی قیمتی گھڑی پر نظر ڈالی اور عجلت میں کہا، "جی فرمایئے۔

، سمیر کے الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ اس نے روتے ہوئے کہا

حضرت... میری ماں... میری دادی کہتی تھیں، اللہ دل میں رہتا ہے، سانسوں میں رہتا ہے۔ میں جب گاؤں میں تھا، تو وہ مجھے ہر جگہ ملتا تھا... ہوا میں، مٹی میں، پرندوں کی آواز" میں... مگر جب سے میں اس شہر آیا ہوں... مجھے وہ کہیں نہیں ملتا۔ "اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ "حضرت، یہاں دل بہت گھبراتا ہے۔ وہ مجھے یہاں کیوں محسوس نہیں ہوتا؟ کیا وہ مجھ "سے ناراض ہو گیا ہے؟

اس نے اپنا زخمی دل، ایک جراح کے سامنے رکھ دیا تھا، مگر جراح کے پاس مرہم نہیں، صرف نشتر تھا۔

، مولانا صاحب نے ایک عالم کی طرح سر ہلایا اور ایک پہلے سے تیار شدہ، منطقی جواب دیا

استغفر اللہ! بیٹا، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اللہ کی ذات ہر احساس سے پاک ہے۔ یہ سب تمہارے نفس کا دھوکہ اور ایمان کی کمزوری ہے۔ شہر فتنوں کی جگہ ہے، یہاں دلوں پر" گناہوں کا زنگ لگ جاتا ہے، اسی لیے احساسات مردہ ہو جاتے ہیں۔ تم پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرو، تہجد پڑھو، ذکر کرو، بری صحبت سے بچو۔ ان شاءاللہ، یہ سب وہم دور ہو "جائیں گے۔

یہ جواب نہیں تھا، یہ ایک فتویٰ تھا۔ یہ تسلی نہیں تھی، یہ ایک الزام تھا۔ سمیر کو لگا جیسے کسی نے اس کے زخم پر مرہم رکھنے کی بجائے، نمک چھڑک دیا ہو۔ وہ "وہم" اور "نفس کے دھوکے" جیسے الفاظ کے بوجھ تلے دب گیا۔ اس کی دادی نے اسے "محسوس" کرنے والا خدا دیا تھا، اور آج علم نے اس سے وہ احساس ہی چھین لیا تھا۔

وہ "جزاک اللہ" کہہ کر پلٹا، مگر اس کی کمر جھک چکی تھی۔ اس کے سوال کا سر قلم کر دیا گیا تھا، مگر اس کے دل کی سسکی وہیں کی وہیں تھی۔

مسجد کا وسیع دروازہ اسے ایک غار کے دہانے کی طرح لگا، جس کے باہر روشنی نہیں، بلکہ اور گہرا اندھیرا تھا۔ اس دن، اس نے فیصلہ کر لیا۔

اس نے جیب سے فون نکالا۔ اس کے ہاتھ کانپ نہیں رہے تھے، وہ ساکت ہو چکے تھے۔ اس نے فہد کا نمبر ملایا۔

"فہد...؟ میں سمیر... تم لوگ کہاں ہو؟... مجھے بھی آنا ہے۔"

.. یہ ایک فون کال نہیں تھی

یہ ایک بھٹکتی ہوئی روح کی، سکون کی تلاش میں، غلط دروازے پر دی گئی پہلی دستک تھی۔

باب 5: زہر کا پہلا گھونٹ

"فہد...؟ میں سمیر... تم لوگ کہاں ہو؟... مجھے بھی آنا ہے۔"

یہ چند الفاظ نہیں تھے، یہ ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی، مدد کے لیے آخری پکار تھی۔ مگر افسوس، اس نے یہ پکار روشنی کی طرف نہیں، بلکہ گرداب کی طرف کی تھی۔

دوسری طرف سے فہد کی ہنستی ہوئی، لاپرواہ آواز آئی

"ارے واہ! آج ہمارا 'مولانا صاحب' بھی پارٹی کے موڈ میں ہے۔ آجا بھائی آجا، 'بلومسٹ' کیفے میں ہیں۔ جلدی آ، تیرا ہی انتظار ہے۔"

بلومسٹ' کیفے۔۔۔ نام بھی کتنا عجیب تھا، دھندلا، غیر حقیقی، دھوئیں میں لپٹا ہوا۔ سمیر نے فون بند کیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کے پیچھے مسجد کے بلند و بالا مینار کھڑے تھے، جیسے اس کے باپ کے پھیلے ہوئے بازو، جو اسے واپس پکار رہے ہوں۔ مگر آج اسے ان بازوؤں میں پناہ نہیں، بلکہ ایک الزام نظر آ رہا تھا۔ اس نے آخری بار ان میناروں کو دیکھا، ایک ایسی نگاہ سے جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہو، اور پھر وہ پلٹا اور مخالف سمت میں چل پڑا۔

اس کا ہر قدم، اس کے دل پر ایک ہتھوڑے کی طرح پڑ رہا تھا۔ وہ چل نہیں رہا تھا، وہ اپنی روح کے جنازے کو اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے، ایک انجانی قبر کی طرف لے جا رہا تھا۔ شہر کا شور، جو پہلے اسے کاٹتا تھا، آج اسے اپنی آغوش میں لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑیوں کے ہارن، اسے لوریاں لگ رہے تھے، اور لوگوں کا ہجوم، اسے ایک گرم کمبل کی طرح محسوس ہو رہا تھا، جس میں وہ اپنی شناخت چھپا سکتا تھا۔

کیفے کا دروازہ، جہنم کے دروازے کی طرح تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، تیز، کان پھاڑتی موسیقی نے اس پر حملہ کر دیا۔ فضا میں درجنوں شیشوں (حقوں) سے اٹھتا میٹھا، مصنوعی اور دم گھوٹنے والا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مدھم، رنگ برنگی روشنیوں میں، انسانوں کے چہرے نہیں، بلکہ صرف ہیولے نظر آ رہے تھے، جو قہقہے لگاتے، دھوئیں کے مرغولے اڑاتے، اپنی ہی دنیا میں گم تھے۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں ہر کوئی خوش نظر آنے کی اداکاری کر رہا تھا۔

،ایک کونے میں، فہد اور اس کے دوستوں کا گروہ بیٹھا تھا۔ فہد نے اسے دیکھتے ہی ایک بلند قہقہہ لگایا

"اوئے دیکھو! کون آیا ہے۔ آجا سمیر، آجا۔ آج تو لگتا ہے جنت کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے سمیر کے قدم وہیں رک گئے۔ یہ طنز اس کے سینے میں ایک خنجر کی طرح ترازو ہو گیا۔ مگر اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ایک خالی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجا کر، لکڑی کے ایک بے جان ٹکڑے کی طرح چلتا ہوا ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھتے ہی، فہد نے شیشے کا لمبا پائپ اس کی طرف بڑھایا۔

"چل بھائی، شروع ہو جا۔ دنیا کے سارے غموں کا علاج ہے یہ۔ دو کش لگا، اور دیکھ، مولانا صاحب کا سارا وعظ بھول جائے گا۔"

سمیر نے کانپتے ہاتھوں سے اس پائپ کو تھاما۔ وہ پائپ نہیں تھا، وہ ایک سانپ تھا، جو اسے ڈسنے کو تیار تھا۔ اس کی نظر شیشے کے اوپر رکھے دہکتے ہوئے کوئلوں پر پڑی۔ اسے اپنی ،دادی کی بات یاد آئی

اللہ نور ہے... "مگر یہ آگ تھی، نور نہیں، جو سب کچھ جلا کر راکھ کر دینے والی تھی۔"

،اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ ایک طرف اس کے کانوں میں دادی کی لرزتی ہوئی دعا گونج رہی تھی

"... یااللہ! میرے بچے کو اندھیروں میں بھٹکنے نہ دینا..." تو دوسری طرف مسجد کے مولانا کا سخت لہجہ گونج رہا تھا، "یہ سب تمہارے نفس کا دھوکہ ہے"

اس نے آنکھیں بند کیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دادی کا روتا ہوا چہرہ، جائے نماز پر گرا وہ آخری آنسو، اور گاؤں کی مسجد کے مینار... سب ایک ایک کر کے گھوم گئے۔ پھر اسے مولانا صاحب کا چہرہ، فہد کی حقارت بھری مسکراہٹ، اور شہر کی تنہائی یاد آئی۔

"اس کے اندر کی ہر شے چیخ رہی تھی، "نہیں سمیر! نہیں! یہ زہر ہے۔

مگر اس کی روح اس قدر زخمی تھی، اس کا دل اس قدر تھک چکا تھا کہ اسے اس زہر میں ہی شفا نظر آئی۔

اس نے پائپ اپنے ہونٹوں سے لگایا، ایک گہرا سانس کھینچا، اور اپنی زندگی کا وہ پہلا کش... زہر کا وہ پہلا گھونٹ... اپنے اندر اتار لیا۔

دھواں اس کے حلق میں ایک تیزاب کی طرح لگا۔ اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑا، اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس کے دوست قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

"اوئے آرام سے، آرام سے۔ پہلی بار ہے ناں، پھیپھڑے بھی سلام کر رہے ہیں۔"

اس کھانسی کے حملے کے بعد، جب اس نے سر اٹھایا، تو اسے اپنے سر میں ایک عجیب سی، میٹھی سی غنودگی محسوس ہوئی۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ موسیقی کا شور اب کانوں میں نہیں، بلکہ اس کے خون میں گردش کر رہا تھا۔ اس کے سینے پر رکھا وہ بھاری پتھر، جو اسے مسجد سے اٹھائے پھر رہا تھا، ایک لمحے کے لیے جیسے کہیں کھو گیا تھا۔

اس نے دوبارہ پائپ اٹھایا۔ اس بار اس کے ہاتھ کانپ نہیں رہے تھے۔ اس نے ایک اور، اس سے بھی گہرا کش لگایا۔

اسے سکون نہیں ملا تھا... ہرگز نہیں۔

مگر مدتوں بعد، اسے درد کو چپ کرانے، اپنی روح کی سسکیوں کو دبانے کا ایک طریقہ مل گیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایک زخم کا سودا، ایک ایسے کینسر سے کر لیا تھا، جسے آگے چل کر اس کے پورے وجود کو کھانا تھا۔

اس رات، 'بلومسٹ' کیفے کے مصنوعی دھندلکوں میں، ایک معصوم روح نے... خودکشی کر لی تھی۔

باب6: دل کا زنگ

زہر کا پہلا گھونٹ، سب سے مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد، ہر اگلا گھونٹ پچھلے سے زیادہ آسان اور زیادہ ضروری لگنے لگتا ہے۔ 'بلو مسٹ' کیفے کی وہ رات، سمیر کی زندگی کی ایک تاریک گلی کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد، اس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، یا شاید، اس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

دن ہفتوں میں، اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ اب اس کی شامیں ہاسٹل کے تنہا کمرے میں نہیں، بلکہ اپنے نئے دوستوں کے ساتھ، شہر کے نئے نئے کیفوں، تیز رفتار گاڑیوں اور بلند آواز قہقہوں میں گزرنے لگیں۔ وہ مصنوعی دھواں، جو پہلی بار اس کے حلق میں ایک تیزاب کی طرح لگا تھا، اب اس کی سانسوں کا حصہ بن چکا تھا۔ اسے اب اپنی روح کی چیخیں سنائی نہیں دیتی تھیں، کیونکہ اس کے کان ہر وقت تیز موسیقی کے شور سے بھرے رہتے تھے۔

اس کی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک وہ سمیر، جو صبح کلاس میں ایک خاموش، سہما ہوا لڑکا ہوتا، اور دوسرا وہ "سیم"، جو رات کو دوستوں کی محفل کی جان ہوتا۔ اس نے جھوٹ بولنا سیکھ لیا تھا، نہ صرف اپنے گھر والوں سے، بلکہ خود اپنے آپ سے بھی۔

ہر ہفتے، جب گاؤں سے دادی اماں یا ابا کا فون آتا، تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑک کر رہ جاتا۔

"ہیلو... بیٹا، کیسا ہے تو؟"

دوسری طرف سے محبت بھری آواز آتی۔

"جی ابا، میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟"

وہ اپنی آواز میں مصنوعی سعادتمندی گھول کر کہتا، جبکہ پس منظر میں اس کے دوست اسے اگلا 'کش' لگانے کا اشارہ کر رہے ہوتے۔

"نماز پڑھتا ہے ناں وقت پر؟"

دادی اماں ضرور پوچھتیں۔

، یہ سوال ہر بار اس کے سینے میں ایک نیزے کی طرح لگتا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو جاتا، پھر ایک سوکھے، بے جان حلق سے کہتا

"جی... جی دادی اماں، پڑھتا ہوں۔"

ہر جھوٹ، اس کے دل پر ایک اور خراش ڈال جاتا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے آخری بار کب سجدہ کیا تھا۔ دادی کا دیا ہوا وہ جائے نماز، اب بھی اس کے بکس میں، کپڑوں کے اندھیرے میں دفن تھا، بالکل اس کی اپنی روح کی طرح۔ کبھی کبھار، کپڑے نکالتے ہوئے، اس کی انگلیوں سے اس کی مخمل چھو جاتی، تو اسے ایک بجلی کا جھٹکا سا لگتا، اور وہ جلدی سے بکس بند کر دیتا، جیسے اس نے کسی دہکتے ہوئے انگارے کو چھو لیا ہو۔

وہ اب وہ سمیر نہیں رہا تھا جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتا تھا۔ اب وہ بے حس ہونا سیکھ گیا تھا۔ کلاس میں کم نمبر آئیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوستوں سے جھگڑا ہو جائے، کوئی پرواہ نہیں۔

—اس کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا

اگلی شام، اگلی محفل، اگلا 'کش'۔

مگر یہ بے حسی صرف باہر کی دنیا کے لیے نہیں تھی، یہ اس کے اندر بھی سرایت کر چکی تھی۔ اسے اب اپنی تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ کبھی خود کے ساتھ تنہا ہوتا ہی نہیں تھا۔

وہ ہر وقت لوگوں کے ہجوم، آوازوں کے شور اور دھوئیں کے بادل میں خود کو چھپائے رکھتا۔

،اس تبدیلی کا سب سے دردناک پہلو، اس کا اپنے والدین سے بڑھتا ہوا فاصلہ تھا۔ اب اسے ان کی کال ایک 'فریضہ' لگتی تھی۔ ان کی فکر، اسے 'لیکچر' محسوس ہوتی، اور ان کی محبت ایک 'جذباتی بلیک میلنگ'۔ وہ ان سے بات کرتے ہوئے چڑچڑا ہو جاتا، ان کے سوالوں کے مختصر اور ٹالنے والے جواب دیتا۔

ایک دن اس کے ابا کا فون آیا۔ ان کی آواز میں ایک عجیب سی تھکاوٹ تھی۔

"بیٹا، کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ فصل پر اس بار کیڑا لگ گیا ہے۔"

، سمیر، جو اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے بےزاری سے کہا

"ابا، ابھی پچھلے مہینے ہی تو بھیجے تھے۔ یہاں شہر میں میرے بھی خرچے ہوتے ہیں۔ دیکھتا ہوں، کچھ کرتا ہوں۔"

اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا، جیسے وہ کسی فقیر کو ٹال رہا ہو۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی احساس نہیں ہوا کہ جس باپ نے اپنی ساری زندگی اس کی خواہشات پوری کرنے میں لگا دی، آج وہ اس سے اپنی 'ضرورت' بیان کرتے ہوئے کتنا چھوٹا محسوس کر رہا ہو گا۔

اس کے دل پر زنگ کی ایک اور، موٹی تہہ چڑھ چکی تھی۔

یہ زنگ اب صرف غفلت کا نہیں تھا... یہ بے حسی کا تھا، یہ خودغرضی کا تھا، یہ ناشکری کا تھا۔

اس کا دل اب ایک صاف شفاف آئینے کی طرح نہیں رہا تھا، جس میں اس کے رب کا عکس نظر آتا۔

اب وہ ایک زنگ آلود، دھندلا شیشہ بن چکا تھا، جس میں اسے اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ لوہے کا زنگ، لوہے کو کھا جاتا ہے۔ اور دل کا زنگ... روح کو کھا جاتا ہے۔

وہ ایک ایسے راستے پر چل پڑا تھا، جہاں ہر اگلا قدم، اسے پچھلے سے زیادہ تاریک کھائی میں گرا رہا تھا، اور وہ اس گرنے کو ہی... اڑان سمجھ رہا تھا۔

حصہ سوم: روح کا کرب

باب 7: خالی ہاتھ، خالی دل

انسان کا سب سے بڑا وہم یہ ہے کہ برا وقت ہمیشہ دوسروں پر آتا ہے۔ سمیر بھی اسی وہم میں جی رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی زندگی، دوستوں کے قہقہوں، دھوئیں کے مرغولوں اور تیز موسیقی کے تال پر ہمیشہ ایسے ہی چلتی رہے گی۔ اس نے اپنے ارد گرد ایک جھوٹی جنت بنالی تھی، اور وہ اس جنت کا بے تاج بادشاہ تھا۔

اس نے، فہد اور چند دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر، پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا موٹا "بزنس" شروع کر لیا تھا۔ یہ شیئر مارکیٹ کا کام تھا، جس میں وہ لوگ مختلف لوگوں سے پیسے لے کر، بغیر کسی گہرے علم اور تجربے کے، سٹے بازی کرتے تھے۔ شروع میں، قسمت ان پر مہربان رہی۔ چند چھوٹے موٹے منافعوں نے ان کے حوصلے بلند کر دیے اور ان کے خواب آسمان کو چھونے لگے۔ سمیر کو لگا کہ اس نے کامیابی کا شارٹ کٹ ڈھونڈ لیا ہے۔

،اس نے نہ صرف اپنے دوستوں سے، بلکہ ہاسٹل کے کئی لڑکوں سے "بڑے منافع" کا لالچ دے کر لاکھوں روپے اکٹھے کر لیے۔ اس نے اپنے ابا کو بھی فون کیا

"ابا، ایک بہت شاندار موقع ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی رقم کا انتظام کر دیں، تو ہم چند ہی مہینوں میں اپنی ساری پریشانیوں سے نکل جائیں گے۔"

اس کے باپ نے، جو اپنی اولاد پر اندھا اعتبار کرتا تھا، اپنی بچی کھچی زمین کا ایک ٹکڑا بیچ دیا اور ساری رقم اپنے بیٹے کے حوالے کر دی۔

سمیر کے پاؤں اب زمین پر نہیں تھے۔ وہ خود کو کسی معاشی ماہر سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اور اس کے دوستوں نے، ایک ہی رات میں کروڑ پتی بننے کے خواب کے ساتھ، وہ ساری رقم، جو تقریباً پچاس لاکھ کے قریب تھی، ایک غیر معروف کمپنی کے شیئرز میں لگا دی۔ ان کے "ماہر" دوست نے انہیں بتایا تھا کہ اس کمپنی کے بارے میں ایک "اندر کی خبر" ہے اور اس کے شیئرز چند ہی دنوں میں آسمان پر پہنچ جائیں گے۔

وہ رات، ان کی زندگی کی سب سے پر جوش رات تھی۔ وہ سب 'بلو مسٹ' کیفے میں بیٹھے، اپنی آنے والی کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ وہ نئی گاڑیوں، بڑے گھروں اور غیر ملکی دوروں کے منصوبے بنا رہے تھے۔ سمیر سوچ رہا تھا کہ وہ سب سے پہلے گاؤں جا کر، اپنے ابا کے ہاتھ پر اتنے پیسے رکھے گا کہ وہ دنگ رہ جائیں گے، اور پھر دادی اماں کو عمرہ کروانے بھیجے گا۔ ایک لمحے کے لیے، اس کے دل میں ایک نیکی کا خیال آیا، مگر یہ خیال بھی دنیا کو دکھانے کے لیے تھا، اللہ کو راضی کرنے کے لیے نہیں۔

اگلی صبح، جب سمیر دیر سے سو کر اٹھا، تو اس کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ سکرین پر درجنوں مسڈ کالز تھیں۔ اس نے بے دلی سے فہد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فہد کی آواز نہیں، بلکہ ایک چیخ سنائی دی۔

"! برباد ہو گئے ہم ! سمیر، ہم لٹ گئے"

سمیر کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔

"کیا... کیا مطلب؟ کیا ہوا؟"

وہ کمپنی فراڈ نکلی!" فہد روتے ہوئے بولا۔"

"!وہ بھاگ گئے ہیں۔ سب ختم ہو گیا۔ سٹاک مارکیٹ کریش کر گئی ہے۔ ہمارے سارے پیسے... ڈوب گئے"

ایک لمحے کے لیے سمیر کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی بلند عمارت سے نیچے گر رہا ہے۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس کے سامنے اس کے دوستوں کے چہرے نہیں، بلکہ ان تمام لڑکوں کے چہرے گھوم گئے جن سے اس نے پیسے لیے تھے۔ اسے اپنے باپ کا تھکا ہوا، امید بھرا چہرہ یاد آیا، جس نے اپنی زمین بیچ کر پیسے اس کے حوالے کیے تھے۔

اس کے حلق سے ایک بے آواز چیخ نکلی۔

، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جن لوگوں نے پیسے دیے تھے، وہ ہاسٹل میں اس کے کمرے پر چڑھ آئے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے، اسے دھمکیاں دے رہے تھے اپنے پیسے واپس مانگ رہے تھے۔ اس کا ہیرو، اس کا رہنما، فہد، اپنا فون بند کر کے کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اس کے وہ دوست، جو کل رات تک اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رہے تھے، آج اسے پہچاننے سے بھی انکاری تھے۔

اسے کمرے سے نکال دیا گیا۔ وہ ہاسٹل کی سیڑھیوں پر اکیلا، بے یار و مددگار بیٹھا تھا۔

اس کی جیب میں چند سو روپے تھے۔ اس کا بینک اکاؤنٹ خالی تھا۔ اس کے دوست غائب تھے۔ اس کا غرور، اس کی، اس کا جھوٹا بھرم، سب کچھ ایک ہی لمحے میں چکنا چور ہو چکا تھا۔

وہ اٹھا، اور ایک زندہ لاش کی طرح، بے مقصد، شہر کی سڑکوں پر چلنے لگا۔ ہر چہرہ اسے ایک دشمن کی طرح گھورتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر آواز اسے ایک گالی کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

رات ہو گئی۔ وہ چلتے چلتے ایک پارک میں پہنچا اور ایک خالی بینچ پر گر گیا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے جسم کو نہیں، اس کی روح کو کاٹ رہی تھی۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ وہ خالی تھیں۔ اس نے اپنا دل ٹٹولا... وہ بھی خالی تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی دو سالہ زندگی ایک فلم کی طرح چلنے لگی۔ وہ قہقہے، وہ محفلیں، وہ دھواں، وہ موسیقی... سب ایک جھوٹ تھا، ایک سراب تھا۔ جب پردہ گرا، تو اسٹیج پر وہ اکیلا کھڑا تھا... خالی ہاتھ، اور خالی دل کے ساتھ۔

وہ امیر بننا چاہتا تھا، مگر آج وہ کائنات کا سب سے غریب انسان تھا۔
وہ کامیاب ہونا چاہتا تھا، مگر آج وہ زندگی کی سب سے بڑی ناکامی تھا۔
وہ دوستوں کا بادشاہ تھا، مگر آج اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے تھے۔ شاید اس کے اندر رونے کے لیے بھی کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہی نیلا آسمان، جسے وہ بچپن میں اللہ کا گھر سمجھتا تھا۔ مگر آج وہ آسمان اسے ایک خالی، سیاہ چادر کی طرح محسوس ہوا، جس میں کوئی نور، کوئی امید نہیں تھی۔

اسے پہلی بار، اپنی زندگی میں پہلی بار، حقیقی تنہائی کا احساس ہوا۔ ایک ایسی تنہائی، جس سے بچنے کے لیے اس نے اتنا شور اکٹھا کیا تھا، آج وہی تنہائی اسے ایک عفریت کی طرح نگل رہی تھی۔

،وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بربادی، اس کی تباہی نہیں تھی۔ یہ اس کے رب کی طرف سے، اس کی روح کے کرب کا پہلا مرحلہ تھا... ایک ایسا مرحلہ، جہاں انسان کو پہلے توڑا جاتا ہے تاکہ اسے نئے سرے سے جوڑا جا سکے۔

....

باب 8: وہ آخری آواز

پارک کے اس ٹھنڈے، ویران بینچ پر کتنی صدیاں بیت گئیں، سمیر کو کچھ ہوش نہ تھا۔ اس کا جسم ٹھنڈ سے اکڑ چکا تھا، اور اس کی روح، مایوسی کی برف میں جم چکی تھی۔ وہ ایک زندہ لاش تھا، جس کی آنکھیں کھلی تھیں، مگر وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں، جس کے کان کھلے تھے، مگر وہ کچھ سن نہیں رہے تھے۔ اس کا وجود، اس کے گناہوں کا ایک چلتا پھرتا مزار بن چکا تھا۔

اسے نہیں معلوم کہ وہ کب تک وہاں پڑا رہتا، اگر اس کے فون کی بیٹری، آخری سانسیں لینے سے پہلے، ایک آخری بار نہ چیختی۔ اس کی جیب میں ایک ارتعاش ہوا۔ اس نے بے دلی سے، ایک روبوٹ کی طرح، فون نکالا۔ سکرین کی مدھم روشنی میں، ایک انجان نمبر چمک رہا تھا، جو اس کے گاؤں کے کسی پڑوسی کا تھا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس وقت... گاؤں سے فون؟ اس کے اندر ایک انجانے، خوفناک اندیشے نے سر اٹھایا۔ اس نے کانپتے ہوئے انگوٹھے سے کال ریسیو کی۔

،دوسری طرف سے اس کے پڑوسی، چاچا کرم دین کی گھبرائی ہوئی آواز آئی

"سمیر بیٹا... تو کہاں ہے؟"

"جی... جی چاچا، میں ٹھیک ہوں... خیریت؟"

اس کی آواز اس کے اپنے حلق میں اجنبی لگ رہی تھی۔

،چاچا کرم دین ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے، جیسے الفاظ ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہوں۔ پھر ان کی آواز ایک سسکی میں ڈوب گئی

"بیٹا... ہمت سے کام لینا۔ تیری... تیری دادی اماں... وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے... صرف ایک لمحے کے لیے کائنات ساکت ہو گئی۔

لفظ "دادی اماں" ایک ہتھوڑے کی طرح سمیر کے وجود پر برسا۔ اسے لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نہیں، بلکہ پوری کائنات کھینچ لی گئی ہو۔ اس کے کانوں میں چاچا کرم دین کے اگلے الفاظ، "انا للہ وانا الیہ راجعون... جنازہ کل صبح دس بجے ہے... پہنچنے کی کوشش کرنا..." ایک بے معنی شور کی طرح گونج کر رہ گئے۔

فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

دادی اماں... چلی گئیں؟

نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بھیانک خواب ہے۔ ابھی تو اس نے ان سے معافی بھی نہیں مانگی تھی۔ ابھی تو اس نے انہیں بتانا تھا کہ وہ کتنا پچھتا رہا ہے۔ ابھی تو اس نے ان کے جھریوں بھرے ہاتھوں کو چومنا تھا۔ ابھی تو اسے ان کی گود میں سر رکھ کر، اپنی ساری بربادی پر رونا تھا۔

اس کے حلق سے ایک جانور کی طرح، ایک وحشی چیخ نکلی۔ وہ چیخ نہیں تھی، وہ اس کی روح کا ماتم تھا، اس کی آخری امید کا جنازہ تھا۔

اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، مگر اس کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی بھر دی۔ وہ اٹھا، اور ایک پاگل کی طرح سڑکوں پر بھاگنے لگا۔ کہاں؟ اسے نہیں معلوم۔ وہ صرف بھاگ رہا تھا، اس ... حقیقت سے، اس آواز سے، اپنی ذات سے

وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، یہاں تک کہ اس کے پھیپھڑے پھٹنے کو آ گئے اور وہ ایک گندی، تاریک گلی میں گر گیا۔ وہ زمین پر گرا، مٹی اور کیچڑ میں لت پت، سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ یہ وہ آنسو تھے جو اس کی بربادی پر نہیں نکلے تھے۔ یہ وہ آنسو تھے جو اس کی زندگی کے سب سے قیمتی، سب سے پاکیزہ رشتے کے چھن جانے پر نکلے تھے۔

یہ اس ہیرے کے کھو جانے کا ماتم تھا، جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا تھا۔

"... اسے یاد آیا... اس کا آخری فون... دادی نے پوچھا تھا، "نماز پڑھتا ہے ناں؟" اور اس نے جھوٹ بولا تھا۔ "جی دادی اماں
اسے یاد آیا... وہ آخری آنسو... جو اس کے گاؤں چھوڑتے وقت، اس کے گال پر گرا تھا۔
"اسے یاد آیا... ان کی وہ دعا... "یا اللہ! میرے بچے کو اندھیروں میں بھٹکنے نہ دینا۔

"... میں بھٹک گیا دادی اماں... میں بہت دور نکل آیا..." وہ کیچڑ میں اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے چیخا۔ "مجھے معاف کر دو... مجھے صرف ایک بار معاف کر دو"

اسے لگا جیسے وہ آواز، چاچا کرم دین کی نہیں تھی، وہ اس کی دادی کی آخری پکار تھی۔ جیسے وہ جاتے جاتے، اسے اس کے بنائے ہوئے جہنم سے نکالنے آئی ہوں۔ جیسے وہ کہہ رہی "... ہوں، "اب بھی وقت ہے بیٹا... لوٹ آ

اس رات، اس گندی گلی میں، کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت، سمیر کو پہلی بار اپنے گناہوں کا حقیقی بوجھ محسوس ہوا۔ اسے اپنی مالی بربادی، دوستوں کا دھوکہ، سب کچھ بھول گیا۔ اسے صرف ایک درد یاد تھا... اپنی دادی کو کھونے کا درد، ان کی محبت کی ناقدری کا درد۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ درد، یہ ناقابل برداشت کرب، اس کے لیے زہر نہیں، تریاق تھا۔

یہ وہ چوٹ تھی جو اس کے دل پر لگے زنگ کو توڑنے والی تھی۔

یہ وہ آگ تھی جس میں جل کر اس کی روح کا سونا، کھوٹ سے الگ ہونے والا تھا۔

یہ وہ آخری آواز تھی، جو اسے واپس زندگی کی طرف، اپنے رب کی طرف، پکار رہی تھی۔

اس نے اپنا ٹوٹا ہوا، خالی وجود سمیٹا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی منزل ایک تھی... گاؤں۔ اسے آخری بار... صرف آخری بار... اپنی جنت کا دیدار کرنا تھا۔

....

باب 9: راکھ کا سفر

اس رات، اس گندی گلی سے جو وجود اٹھا، وہ سمیر نہیں تھا... وہ اپنی ہی روح کی ایک جلتی ہوئی لاش تھی، جو راکھ کا ایک ڈھیر بن چکی تھی۔ اس کے اندر سے تمام احساسات، تمام خواہشات، تمام خواب جل چکے تھے۔ صرف ایک آگ باقی تھی- پچھتاوے کی آگ۔ اور ایک ہی منزل تھی- گاؤں۔

اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ چند مڑے تڑے نوٹ اور کچھ سکے... بس یہی اس کی کل کائنات تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ ہر قدم ایک عذاب، تھا۔ شہر کی روشنیاں، جو کبھی اسے اپنی طرف کھینچتی تھیں، آج اسے چبھ رہی تھیں۔ ہر قہقہہ، اس کے کانوں میں ایک گالی کی طرح گونج رہا تھا۔ وہ لوگوں سے نظریں چرا رہا تھا اپنے آپ کو چھپا رہا تھا، جیسے وہ کوئی مجرم ہو، جو جائے واردات سے بھاگ رہا ہو۔

اس کے کپڑے کیچڑ اور گندگی سے لت پت تھے، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، اور اس کی آنکھیں، رات بھر کے رونے سے سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بھکاری لگ رہا تھا، ایک ایسا بھکاری، جو دنیا سے نہیں، خود اپنی ذات سے خیرات مانگ رہا تھا۔

اسے گاؤں جانے والی آخری بس، ایک پرانی، خستہ حال گاڑی، مل گئی۔ اس نے اپنا سارا بچا کھچا پیسہ کنڈکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک کونے کی ٹوٹی ہوئی سیٹ پر جا کر گر گیا۔ بس، میں گاؤں کے سادہ لوگ، کسان اور مزدور بیٹھے تھے، جو اپنی تھکی ہوئی آنکھوں سے اس "شہری بابو" کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ شہری بابو ان سب سے زیادہ ٹوٹا ہوا، ان سب سے زیادہ غریب تھا۔

جیسے ہی بس نے شہر کی حدود کو چھوڑا، اور کچے راستوں پر ہچکولے کھانے شروع کیے، سمیر نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ شہر کی مصنوعی، بدبودار ہوا پیچھے رہ گئی، اور کھیتوں کی گیلی مٹی کی جانی پہچانی، پاکیزہ خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

، یہ خوشبو... یہ وہی خوشبو تھی جو اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ اس خوشبو کے ٹکراتے ہی، اس کے اندر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی سسکیاں، بس کے انجن کے شور میں دب رہی تھیں، مگر اس کا درد، کائنات کے ہر ذرے کو رلا رہا تھا۔

وہ رو رہا تھا... ان تمام جھوٹوں پر جو اس نے اپنی دادی سے بولے تھے۔

وہ رو رہا تھا... اس باپ کے اعتبار پر، جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے توڑا تھا۔

وہ رو رہا تھا... ان تمام نمازوں پر، جو اس نے قضا کی تھیں۔

وہ رو رہا تھا... اس سجدے کی لذت پر، جسے اس نے چند لمحوں کی جھوٹی خوشی کے لیے بیچ دیا تھا۔

اس کا ہر آنسو، اس کے دل پر لگے زنگ کو دھو رہا تھا، اس کی روح کے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔

سفر لمبا اور اذیت ناک تھا۔ ہر گاؤں، ہر درخت، ہر موڑ جو قریب آ رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر رہا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ کس منہ سے گھر جائے گا؟ وہ کس منہ سے اپنے باپ کا سامنا کرے گا؟ وہ کس منہ سے اپنی دادی کے بے جان وجود کو دیکھے گا؟

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ صرف ایک راکھ کا ڈھیر تھا، جسے ہوا اپنے آخری ٹھکانے کی طرف اڑا رہی تھی۔

جب بس اس کے گاؤں کے اڈے پر رکی، تو صبح کی پہلی، اداس کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ گاؤں میں ایک عجیب، ماتمی خاموشی تھی۔ وہ بس سے اترا، اور اس کے قدم وہیں جم گئے۔

سامنے، اس کے بچپن کا دوست، علی، کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ اس نے سمیر کو دیکھا، اور ایک لفظ کہے بغیر، آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

اس ایک لمحے میں، جب علی کے بازوؤں نے اسے سہارا دیا، سمیر کو لگا جیسے وہ صدیوں بعد، پہلی بار زمین پر کھڑا ہوا ہے۔

"...دیر کر دی تو نے"

علی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

...سمیر کچھ بول نہ سکا۔ وہ صرف اپنے دوست کے کندھے پر سر رکھے، روتا رہا... روتا رہا

یہ سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ تو اس کے راکھ کے ڈھیر سے، ایک نئی زندگی کے پھوٹنے کی شروعات تھی۔ یہ اس کے جہنم سے واپسی کا پہلا قدم تھا، اس جنت کی طرف، جس کا چہرہ وہ آخری بار دیکھنے آیا تھا۔

....

باب 10: وہ آخری دیدار

گھر کا راستہ... صرف چند قدموں کا تھا، مگر سمیر کو لگا جیسے وہ ایک لامتناہی، کانٹوں بھری راہ پر چل رہا ہے۔ ہر قدم، اس کے سینے پر ایک نئے زخم کی طرح لگتا۔ گاؤں کے لوگ اسے دیکھ رہے تھے، ان کی نگاہوں میں غصہ نہیں، بلکہ ایک گہرا، خاموش افسوس تھا۔ وہ افسوس، کسی بھی طعنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔

گھر کے دروازے پر رش تھا، مگر ایک ماتمی سناٹا ہر آواز پر غالب تھا۔ جیسے ہی وہ صحن میں داخل ہوا، اس کی نظر سامنے پڑی چارپائی پر پڑی، جس پر ایک سفید چادر میں لپٹا، ایک بے جان وجود رکھا تھا۔

ایک لمحے کے لیے... وقت رک گیا۔

وہ وجود... وہ مقدس وجود... جس کی گود اس کی پہلی کائنات تھی، جس کے لمس میں جنت کا سکون تھا، جس کی دعائیں اس کی سب سے بڑی ڈھال تھیں... آج خاموش، ساکت اور بے حرکت پڑا تھا۔

سمیر کے پیر منوں وزنی ہو گئے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخے، چلائے، مگر اس کے حلق میں جیسے کسی نے سیسہ پگھلا کر بھر دیا ہو۔

وہ ایک زندہ لاش کی طرح، قدم گھسیٹتا ہوا، اس چارپائی کی طرف بڑھا۔

اس کے ابا، جو دیوار سے ٹیک لگائے، ایک ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح کھڑے تھے، نے اسے دیکھا۔

ان کی آنکھوں میں نہ غصہ تھا، نہ سوال، صرف ایک باپ کی بے پناہ، بے بسی بھری تھکاوٹ تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا، صرف اپنا ہاتھ بڑھا کر، اسے سہارا دیا۔

کسی نے لرزتے ہاتھوں سے، اس کے چہرے سے سفید چادر ہٹائی۔

اور پھر... قیامت ٹوٹ پڑی۔

وہ چہرہ... وہی نورانی چہرہ... مگر آج اس پر وہ مسکراہٹ نہیں تھی، وہ شفقت نہیں تھی۔ آنکھیں بند تھیں، ہونٹ خاموش تھے، اور چہرے پر ایک ایسا سکون تھا، جیسے وہ اپنے رب کے پاس پہنچ کر، دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو گئی ہوں۔

سمیر، اس چہرے کو دیکھ کر، وہیں چارپائی کے پاس، زمین پر گر گیا۔

"!... دادی اماں"

اس کے حلق سے ایک ایسی چیخ نکلی، جس نے آسمان کو بھی رلا دیا۔

"اٹھیں... مجھ سے بات کریں... مجھے ڈانٹیں... مجھے ماریں... مگر خدارا، اس طرح خاموش نہ رہیں۔"

وہ ایک پاگل کی طرح، ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔

دیکھیں... آپ کا نافرمان بیٹا لوٹ آیا ہے۔ میں بھٹک گیا تھا... میں اندھا ہو گیا تھا... مجھے معاف کر دیں... صرف ایک بار... صرف ایک بار کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف "
"... کیا

اس کے آنسو، ان کے بے جان قدموں کو بھگو رہے تھے۔ وہ ان قدموں کو چوم رہا تھا، اپنے ماتھے پر مل رہا تھا، مگر ان میں کوئی حرکت نہیں تھی۔

لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ کسی بچے کی طرح، اپنی ماں کے آنچل سے چمٹ گیا تھا۔

پھر جنازہ اٹھا۔ "لاالہ الااللہ..." کی صدائیں بلند ہوئیں۔ یہ وہ کلمہ تھا جو اس کی دادی نے اسے سکھایا تھا۔ آج یہی کلمہ، اس کی دنیا کو اس سے چھین کر لے جا رہا تھا۔

اس نے اپنے باپ اور گاؤں والوں کے ساتھ، اس جنازے کو کندھا دیا۔

وہ صرف ایک لکڑی کا جنازہ نہیں تھا، وہ اس کی اپنی زندگی، اس کی خوشیوں، اس کی معصومیت کا جنازہ تھا، جسے وہ اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے، قبرستان کی طرف لے جا رہا تھا۔

قبرستان کا منظر، اس کی روح کو تحلیل کر دینے والا تھا۔

جب اس مقدس وجود کو، قبر کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اتارا جا رہا تھا، تو سمیر کو لگا جیسے کوئی اسے نہیں، بلکہ اس کی اپنی روح کو زمین میں دفن کر رہا ہے۔

جب لحد پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، تو ہر پھاوڑا، اس کے دل پر چل رہا تھا۔ اس نے بھی کانپتے ہاتھوں سے، تین مٹھی مٹی اٹھائی۔

پہلی مٹھی... اس نے اپنے ان تمام گناہوں کے نام پر ڈالی، جو اس نے کیے تھے۔
دوسری مٹھی... اس نے اپنے ان تمام جھوٹوں کے نام پر ڈالی، جو اس نے بولے تھے۔
تیسری مٹھی... اس نے اپنے اس غرور اور تکبر کے نام پر ڈالی، جس نے اسے اندھا کر دیا تھا۔

وہ مٹی نہیں تھی، وہ اپنے گناہوں کا اعتراف تھا، جو وہ آج سب کے سامنے، اپنے رب کے سامنے، اور اس قبر میں سوئی ہوئی ہستی کے سامنے کر رہا تھا۔

تدفین کے بعد، جب سب لوگ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے، سمیر کی نظر آسمان کی طرف اٹھی۔

اس کی آنکھوں میں اب کوئی سوال نہیں تھا، کوئی گلہ نہیں تھا۔ صرف ایک ٹوٹی ہوئی، بے آواز التجا تھی۔

"یااللہ... میں نے سب کچھ کھو دیا... سب کچھ... میرے پاس اب کچھ نہیں بچا... نہ دنیا، نہ عزت، نہ بھروسا... اور آج... تو نے مجھ سے میری جنت بھی واپس لے لی... اب میرے پاس... تیرے سوا کوئی نہیں ہے... کوئی نہیں... مجھے... مجھے قبول کر لے مولا... میں بہت گندا ہوں... بہت گناہ گار ہوں... مگر میں تیرا ہوں... مجھے صاف کر دے... مجھے اپنا بنا لے..."

اس کی دعا کے الفاظ نہیں تھے، صرف سسکیاں تھیں۔

ایک ایسی ٹوٹی ہوئی روح کی سسکیاں، جو آج، اپنی زندگی میں پہلی بار، سچے دل سے، اپنے خالق کو پکار رہی تھی۔

اس دن، قبرستان میں، ایک وجود دفن ہوا تھا

اور ایک نئی روح نے، اسی مٹی سے، جنم لیا تھا...

حصہ چہارم: نور کا پہلا قطرہ

باب 11: تنہائی کا زہر

تدفین کے بعد کے دن، قیامت کے دنوں سے زیادہ بھاری تھے۔ گاؤں کا گھر، جو کبھی اس کی پناہ گاہ تھا، اب اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ گھر کا ہر کونا، ہر چیز، اسے دادی اماں کی یاد دلاتی اور اس کا دل ایک تیز دھار خنجر کی طرح چیر کر رکھ دیتی۔ وہ جائے نماز، جو اب بھی ان کی چارپائی پر بچھا تھا، اسے دیکھ کر سمیر کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کمرے میں قدم بھی رکھ سکے۔

گاؤں کے لوگ آتے، افسوس کرتے، اور چلے جاتے۔ مگر ان کی ہمدردی بھری نگاہیں، اسے اپنے جرم کا احساس اور شدت سے دلاتیں۔ وہ کسی سے نظر نہیں ملا پاتا تھا۔ سب سے کٹھن مرحلہ، اپنے باپ کا سامنا کرنا تھا۔

،اس کے ابا، ایک خاموش مجسمے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ سارا دن، چپ چاپ، خالی نظروں سے دیواروں کو گھورتے رہتے۔ انہوں نے ایک بار بھی سمیر سے اس کے پیسے ڈوبنے اس کی پڑھائی چھوٹنے یا اس کے جھوٹ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ان کی یہ خاموشی، کسی بھی طعنے، کسی بھی گالی سے زیادہ اذیت ناک تھی۔ یہ ایک ایسی خاموشی تھی، جو چیخ چیخ کر ، کہہ رہی تھی

"تم نے صرف میری بیوی نہیں، میرا اعتبار، میرا فخر، میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔"

سمیر ہر روز مرتا، اور ہر روز جی اٹھتا۔ وہ ان کے لیے پانی لے کر جاتا، کھانا رکھتا، مگر وہ ایک لفظ کہے بغیر، اسے اٹھا لیتے۔ باپ بیٹے کے درمیان، ایک نہ دکھنے والی، شیشے کی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔

چند دنوں بعد، گاؤں کے لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے، اور گھر میں صرف دو زندہ لاشیں رہ گئیں- ایک وہ، اور دوسرا اس کا باپ۔

اب، حقیقی تنہائی نے اپنا زہر پھیلانا شروع کیا۔

شہر میں، وہ شور میں اپنی تنہائی کو چھپاتا تھا۔ یہاں، گاؤں کی خاموشی، اس کی تنہائی کو اور بھیانک بنا رہی تھی۔ راتیں سب سے زیادہ قیامت خیز تھیں۔ جب پورا گاؤں سو جاتا، تو اس کے اندر کا شور اسے سونے نہیں دیتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے، اس کی دو سالہ زندگی کی فلم چلتی۔ فہد کا قہقہہ، شیشے کا دھواں، دوستوں کی محفلیں، اور پھر... دادی کا بے جان چہرہ، باپ کی خاموشی، لوگوں کی افسوس بھری نگاہیں۔

اس کا دماغ پھٹنے کو آ جاتا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا، کبھی اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگتا۔ اسے اپنا وجود ایک قید خانہ لگتا، جس سے وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس تنہائی کے زہر نے، اس کے اندر ایک عجیب و غریب تبدیلی پیدا کی۔

اسے یاد آنے لگا... وہ سب کچھ، جسے وہ بھول چکا تھا۔

اسے یاد آیا... بچپن میں دادی کا اسے کہانیاں سنانا۔

اسے یاد آیا... ابا کا اسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر میلہ دکھانا۔

اسے یاد آیا... اس کا پہلا روزہ، اور اس کی پہلی عید۔

اسے یاد آیا... اس کا پہلا سجدہ... اور اس سجدے کا سکون۔

اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس نے کیا کھو دیا ہے۔ اس نے صرف پیسہ یا عزت نہیں کھوئی تھی، اس نے اپنی زندگی کی سب سے پاکیزہ، سب سے خوبصورت یادیں، اپنے ہی ہاتھوں سے گندی کر دی تھیں۔

ایک رات، جب اس کی بے چینی انتہا کو پہنچ گئی، اور اسے لگا کہ وہ واقعی پاگل ہو جائے گا، وہ بستر سے اٹھا۔ اس کے قدم، خود بخود، دادی اماں کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا، مگر چاند کی روشنی، کھڑکی سے چھن کر، سیدھا اس جگہ پڑ رہی تھی، جہاں وہ جائے نماز بچھا تھا۔

وہ کانپتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان تھا۔ ایک طرف خوف تھا، اپنے گناہوں کا، اپنی ناپاکی کا... تو دوسری طرف، ایک انجانی کشش، جو اسے اس جائے نماز کی طرف کھینچ رہی تھی۔

وہ گھٹنوں کے بل، اس جائے نماز کے سامنے گر گیا۔

...اس نے لرزتے ہاتھوں سے، اس کی مخملی سطح کو چھوا۔ وہی جانی پہچانی مہک... وہی عطرِ حنا، وہی پاکیزگی، وہی سکون

،اس لمس نے، اس کے وجود میں جمی برف کو پگھلا دیا۔ اس کے حلق سے ایک ایسی سسکی نکلی، جو سالوں سے اس کے اندر قید تھی۔ وہ اس جائے نماز پر سر رکھ کر، ایک چھوٹے کھوئے ہوئے بچے کی طرح رونے لگا۔

"...میں ہار گیا... یا اللہ... میں سب کچھ ہار گیا"

وہ ہچکیوں کے درمیان بولا۔

میرے پاس کچھ نہیں بچا... کوئی نہیں بچا... میں بہت اکیلا ہوں... بہت اکیلا... یہ تنہائی مجھے مار ڈالے گی... مجھے اس زہر سے بچا لے مولا... مجھے اپنے پاس بلا لے... یا مجھے جینے" "...کا کوئی راستہ دکھا دے

وہ روتا رہا، بولتا رہا، اپنے دل کا سارا غبار نکالتا رہا۔ وہ کسی انسان سے نہیں، اس ذات سے ہمکلام تھا، جو دلوں کے حال جانتی ہے۔

اسے نہیں معلوم کہ وہ کب تک روتا رہا۔

مگر جب اس نے سر اٹھایا، تو باہر، مسجد کے مینار سے، فجر کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"...اللہ اکبر...اللہ اکبر"

وہ آواز... وہ پکار... جو صدیوں سے کائنات میں گونج رہی تھی، آج، اس کی زندگی میں پہلی بار، سیدھا اس کے دل پر لگی۔

اسے لگا جیسے یہ اذان، کسی اور کے لیے نہیں، صرف اس کے لیے ہے۔ جیسے اس کا رب، اس کی تنہائی، اس کے آنسوؤں کا جواب دے رہا ہے۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو:

"تم اکیلے نہیں ہو... میں تو ہمیشہ سے یہیں تھا... تمہاری شہ رگ سے بھی قریب... تم ہی مجھ سے دور چلے گئے تھے۔"

تنہائی کا زہر، جو اسے مارنے آیا تھا، آج اس کے لیے امرت بن گیا تھا۔ اس زہر نے، اس کے اندر کے تمام جھوٹے سہاروں کو مار دیا تھا، تاکہ وہ اپنے سب سے بڑے، اور واحد حقیقی سہارے کو پہچان سکے۔

اس اذان کی آواز میں، ایک ٹوٹی ہوئی روح کے لیے، نور کا پہلا قطرہ... امید کی پہلی کرن... پوشیدہ تھی۔

....

باب 12: اذان کی پکار

"...اللہ اکبر...اللہ اکبر"

یہ صرف الفاظ نہیں تھے، یہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی کا اعلان تھا، جو فضا کی خاموشی کو چیرتا ہوا، سید ھا سمیر کی روح میں اتر رہا تھا۔ اس نے زندگی میں ہزاروں بار اذان سنی تھی، مگر آج، اس کی سماعت الگ تھی، اس کا ادراک الگ تھا۔

پہلے، اذان اس کے لیے صرف وقت کا ایک پیمانہ تھی۔ صبح ہونے کا اعلان، نماز کے وقت کی یاد دہانی، یا افطار کا اشارہ۔ یہ اس کے کانوں سے ٹکراتی اور گزر جاتی، بالکل کسی بھی دوسری آواز کی طرح۔

مگر آج... اس جائے نماز پر سر رکھے، آنسوؤں میں شرابور، اپنی مکمل بے بسی اور شکستگی کے عالم میں، یہ آواز اس کے لیے ایک پکار تھی۔ ایک ذاتی دعوت نامہ۔

اسے لگا جیسے یہ آواز، مسجد کے مینار سے نہیں، بلکہ آسمان کے اس پار سے آ رہی ہے۔ جیسے اس کا خالق، اس کا رب، جسے وہ شہر کی بھیڑ میں کھو آیا تھا، آج گاؤں کی اس پرسکون صبح میں، براہِ راست اس سے مخاطب ہے۔

اللہ اکبر..."(اللہ سب سے بڑا ہے)"

اس کے کانوں میں یہ آواز گونجی، تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔

بڑا؟ کون بڑا؟ وہ پیسہ، جس کے پیچھے وہ بھاگا؟ وہ دوست، جن پر اسے ناز تھا؟ وہ شہرت، جس کا وہ بھوکا تھا؟ یا وہ "میں"، جس کے غرور نے اسے اندھا کر دیا تھا؟
نہیں! سب جھوٹ تھا، سب فانی تھا۔ سب ایک لمحے میں ریت کے گھروندے کی طرح بہہ گیا۔ بڑا... صرف وہی ہے، جو ہمیشہ سے تھا، اور ہمیشہ رہے گا۔

اشھدان لاالہ الااللہ... "(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)"

اس کے وجود میں ایک کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے کس کس کو اپنا معبود نہیں بنایا تھا؟ اس نے پیسے کو پوجا، اس نے شہرت کو پوجا، اس نے دوستوں کو پوجا، اس نے اپنی خواہشات کو پوجا... اور ان سب جھوٹے خداؤں نے، اسے عین وقت پر اکیلا چھوڑ دیا۔ معبود... پوجنے کے لائق... صرف وہی تھا، جو اپنے پجاری کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

اشھدان ان محمدارسول اللہ... "(میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں)"

اسے یاد آیا... بچپن میں دادی کا اسے حضور ﷺ کے قصے سنانا۔ ان کی ایمانداری، ان کی ہمدردی، ان کی سادگی... اور پھر اسے اپنی زندگی یاد آئی، جو جھوٹ، بے حسی اور تکبر سے بھری تھی۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ وہ اس عظیم نبی کا امتی کہلانے کے لائق کہاں تھا؟

حی علی الصلاۃ... "(آؤ نماز کی طرف)"

یہ ایک حکم نہیں تھا، یہ ایک ماں کی پکار تھی۔ جیسے کوئی ماں، اپنے کھوئے ہوئے، زخمی بچے کو اپنی آغوش میں بلا رہی ہو۔ "آ جا میرے بچے... بہت بھٹک لیا، بہت چوٹیں کھا لیں۔
"آ، میرے پاس آ، میرے دامن میں چھپ جا، یہاں سکون ہے۔
اسے لگا جیسے یہ آواز، اس کے لیے، صرف اس کے لیے ہے۔

حی علی الفلاح... "(آؤ کامیابی کی طرف)"

کامیابی؟ کون سی کامیابی؟ وہ، جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ برباد ہو گیا؟ نہیں! اذان بتا رہی تھی کہ حقیقی کامیابی، پیسے، شہرت یا طاقت میں نہیں... حقیقی کامیابی، اس کے رب کے سامنے جھک جانے میں ہے۔ حقیقی کامیابی، اس سجدے میں ہے، جسے وہ چھوڑ آیا تھا۔

"...اللہ اکبر...اللہ اکبر"

"...لاالہ الااللہ"

اذان ختم ہو گئی۔ مگر اس کی گونج، سمیر کے پورے وجود پر طاری تھی۔ اس کا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے وہ اس کے سینے کو توڑ کر باہر آ جائے گا۔

یہ اذان نہیں تھی... یہ اس کی روح کا غسل تھا۔
یہ پکار نہیں تھی... یہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا مرہم تھی۔
یہ آواز نہیں تھی... یہ ایک رسی تھی، جو اندھیرے کنویں میں بھٹکتے ہوئے، اس کے لیے اوپر سے لٹکائی گئی تھی۔

وہ وہیں، اسی جائے نماز پر، بے سدھ بیٹھا رہا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے، مگر اس کی روح، سالوں بعد، آج پہلی بار، سکون کا سانس لے رہی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے باپ کا سامنا کیسے کرے گا، لوگوں کے قرضے کیسے اتارے گا، یا اپنی زندگی کو دوبارہ کیسے شروع کرے گا۔

... مگر ایک بات وہ جانتا تھا

اسے اس پکار کا جواب دینا ہے۔

اس نے اٹھ کر، لرزتے قدموں سے، غسل خانے کی طرف قدم بڑھائے۔ آج، وہ صرف اپنے جسم کو نہیں، بلکہ اپنے ماضی کے ہر گناہ، ہر جھوٹ، ہر نافرمانی کو دھونے جا رہا تھا۔

آج، کئی سالوں کے بعد... سمیر، اپنے رب کے حضور، پہلا سجدہ کرنے جا رہا تھا۔

....

باب 13: وہ پہلا سجدہ

غسل خانے کا ٹھنڈا پانی، جب اس کے جسم پر پڑا، تو اسے لگا جیسے یہ صرف پانی نہیں، بلکہ رحمت کی ایک برکھا ہے، جو اس کے وجود کے ہر کونے میں سرایت کر کے، سالوں کی غلاظت کو دھو رہی ہے۔ ہر بہتا ہوا قطرہ، اس کے کسی گناہ، کسی جھوٹ، کسی نافرمانی کو بہا کر لے جا رہا تھا۔ اس نے وضو نہیں کیا، اس نے اپنی روح کا سنگھار کیا۔

جب وہ پاک صاف ہو کر باہر نکلا، تو اس کا جسم ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس پر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے قدم، خود بخود، گاؤں کی چھوٹی، پرانی مسجد کی طرف اٹھ گئے۔

مسجد کا راستہ... وہی جانا پہچانا راستہ تھا، مگر آج اس پر چلنے والا مسافر، ایک نیا مسافر تھا۔ یہ وہ سمیر نہیں تھا، جو دنیا جیتنے نکلا تھا، یہ وہ شکستہ روح تھی، جو اپنے رب کو منانے نکلی تھی۔

مسجد کے دروازے پر پہنچ کر، اس کے قدم ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ اسے اپنی ناپاکی، اپنے گناہوں کا پہاڑ یاد آیا۔ وہ کس منہ سے، اس پاک گھر میں داخل ہو؟ اس کا دل چاہا کہ وہ واپس بھاگ جائے، مگر اس کے اندر سے اذان کی وہ پکار، "حی علی الصلاۃ"، اسے زنجیروں کی طرح کھینچ رہی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، ایک گہرا سانس لیا، اور "بسم اللہ" پڑھ کر، کانپتا ہوا دایاں قدم، مسجد کے ٹھنڈے فرش پر رکھ دیا۔

ایک لمحے کو لگا، جیسے وہ آگ کے دریا سے نکل کر، جنت کے باغ میں آ گیا ہو۔

مسجد کے اندر، فجر کی نماز کے بعد، چند بزرگ بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ ان کے نورانی چہرے، اور قرآن کی مدھر آواز، اس ماحول میں ایک ایسا سکون رہی تھی، جسے سمیر کی روح صدیوں سے ترس رہی تھی۔

کسی نے اسے نہیں دیکھا، کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

وہ ایک کونے میں، دیوار کے ساتھ، چپ چاپ بیٹھ گیا۔ وہ نماز پڑھنے نہیں آیا تھا، وہ تو صرف اس گھر کی پناہ میں، چند لمحے بیٹھنے آیا تھا۔

اچانک، اس کی نظر، مسجد کے کونے میں رکھی، ایک پرانی، لکڑی کی رحل پر پڑی، جس پر ایک بوسیدہ، جزدان میں لپٹا، قرآن کا ایک نسخہ رکھا تھا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ وہی قرآن تھا، جسے وہ بچپن میں، اپنی دادی کی گود میں بیٹھ کر، سپارہ پڑھا کرتا تھا۔

وہ اٹھا، اور ایک مقناطیسی کشش کے تحت، اس رحل کی طرف بڑھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے، اس قرآن کو اٹھایا، اسے چوما، اور اپنی آنکھوں سے لگایا۔ سالوں کی گرد، اس کی انگلیوں پر لگ گئی، مگر اسے لگا، جیسے اس کی روح کا سارا زنگ، ایک لمحے میں اتر گیا ہو۔

اس نے قرآن کھولا۔ اسے پڑھنا نہیں آتا تھا، وہ تو کب کا الف، ب، بھول چکا تھا۔ مگر اس نے اپنی انگلی، ان مقدس حروف پر پھیرنی شروع کر دی۔

اور پھر... وہ ٹوٹ گیا۔

وہ وہیں، اس قرآن کو سینے سے لگائے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ ندامت کے آنسو تھے، یہ شکر کے آنسو تھے، یہ اپنے رب سے، سالوں کی دوری کے بعد، ملاقات کے آنسو تھے۔

اس کا رونا، اس کی سسکیاں، اتنی بلند تھیں کہ مسجد میں بیٹھے بزرگوں نے بھی تلاوت روک دی۔ مسجد کے امام صاحب، ایک شفیق، نورانی چہرے والے بزرگ، اپنی جگہ سے اٹھے، اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے، اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ نہ اسے ڈانٹا، نہ اس سے کوئی سوال کیا۔ انہوں نے صرف اپنا ایک ہاتھ، بہت نرمی سے، بہت شفقت سے، سمیر کے کانپتے ہوئے کندھے پر رکھ دیا۔

...وہ لمس... وہ ایک بزرگ کا، ہمدردی بھرا لمس

اس لمس میں، نہ شہر کے مولانا کا علمی تکبر تھا، نہ فہد کا زہریلا طنز۔ اس لمس میں، اس کے باپ جیسی شفقت تھی، اس کی دادی جیسی ممتا تھی۔

اس ایک لمس نے، سمیر کے اندر ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے۔ وہ امام صاحب کے قدموں میں گر گیا، اور ایک بچے کی طرح، ان سے لپٹ کر رونے لگا۔

"...میں... میں بہت گناہ گار ہوں... میں بھٹک گیا تھا... میں واپس آنا چاہتا ہوں... مجھے راستہ دکھائیں"

امام صاحب نے اسے اٹھایا، اسے اپنے سینے سے لگایا، اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "میرے بچے... واپس آنے والے کو، بھٹکا ہوا نہیں کہتے۔ اسے تو 'مہمان' کہتے ہیں۔
"اور تم تو آج، اپنے رب کے مہمان بن کر آئے ہو۔

پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ کھڑا کیا۔

"آؤ... اپنے رب کا شکریہ ادا کرو، کہ اس نے تمہیں، اپنے گھر کا راستہ دکھا دیا۔"

امام صاحب نے نیت باندھی، اور سمیر نے بھی، ان کے پیچھے، لرزتے ہوئے، نیت باندھ لی۔

"...اللہ اکبر"

اور پھر وہ لمحہ آیا... جس کے لیے کائنات بنائی گئی تھی۔

وہ لمحہ، جب انسان، اپنی ساری اوقات، اپنا سارا غرور، اپنی ساری "میں"، خاک میں ملا کر، اپنے خالق کے حضور، اپنا ماتھا ٹیک دیتا ہے۔

جیسے ہی سمیر کی پیشانی، سجدے میں، مسجد کے ٹھنڈے فرش سے لگی، اسے لگا جیسے وہ زمین پر نہیں، عرش پر پہنچ گیا ہے۔

اس کی آنکھیں بند تھیں، مگر اس کا دل، آج سالوں بعد، کھل گیا تھا۔

اس ایک سجدے میں... اسے وہ سکون ملا، جو اسے شہر کے ہزاروں قہقہوں، لاکھوں محفلوں میں نہ مل سکا تھا۔

اس ایک سجدے میں... اسے وہ اپنائیت ملی، جو اسے دنیا کے کسی رشتے میں محسوس نہ ہوئی تھی۔

اس ایک سجدے میں... اس نے اپنے آپ کو کھو دیا، اور اپنے رب کو پا لیا۔

...وہ سجدہ، لمبا ہوتا گیا... طویل ہوتا گیا

:اس کے آنسو، جائے نماز کو بھگو رہے تھے، اور اس کا دل، زیرِ لب، صرف ایک ہی التجا کر رہا تھا

"...یا اللہ... مجھے اٹھنے نہ دینا... مجھے بس یہیں رہنے دے... اپنے قدموں میں... ہمیشہ کے لیے"

یہ ایک گناہ گار بندے کا، سالوں بعد... پہلا سجدہ تھا۔

یہ ایک کھوئے ہوئے بیٹے کی، اپنے باپ کی آغوش میں، واپسی تھی۔

یہ ایک ٹوٹی ہوئی روح کا، اپنے خالق سے، وصال تھا۔

....

باب 14: رہبر کی تلاش

وہ سجدہ، ایک لمحہ نہیں، ایک پوری زندگی تھا۔ جب سمیر نے امام صاحب کے سلام پھیرنے پر، اپنا سر اٹھایا، تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، مگر اس کی روح، ایک ایسی سیرابی اور سکون سے لبریز تھی، جس سے وہ کبھی آشنا ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی ابھی، ایک نئی، پاکیزہ دنیا میں پیدا ہوا ہے۔

نماز کے بعد، جب باقی لوگ مسجد سے چلے گئے، تو امام صاحب، جن کا نام مولانا ہاشم تھا، وہیں اس کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے سمیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور ایک ایسی مسکراہٹ سے اسے دیکھا، جس میں شفقت کی ایک جھیل موجزن تھی۔

"کیسے ہو میرے بچے؟"

ان کی آواز میں زمانے بھر کی مٹھاس تھی۔

سمیر کچھ بول نہ سکا۔ اس کی نظریں شرمندگی اور ندامت کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کیا بتاتا؟ کیسے بتاتا کہ وہ کون ہے، اور کن اندھیروں سے ہو کر آیا ہے؟

، مولانا ہاشم جیسے اس کے دل کا حال پڑھ گئے ہوں۔ انہوں نے نرمی سے کہا، "تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے آنسو، تمہاری ہر کہانی سنا رہے ہیں۔ اور تمہارا رب "تمہاری ہر سسکی کو سن رہا ہے۔

، پھر انہوں نے اپنے قریب کیا

"جانتے ہو، توبہ کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے، جیسے اس نے کبھی کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ تم آج، ایک نوزائیدہ بچے کی طرح پاک ہو۔"

یہ الفاظ... یہ کسی عالم کے الفاظ نہیں تھے، یہ ایک باپ کے الفاظ تھے، جو اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگا رہا تھا۔ سمیر نے ہمت کی، اور اپنی ٹوٹی پھوٹی آواز میں، سب کچھ بتا دیا۔ اپنا شہر جانا، دوستوں کی صحبت، دھوئیں کی محفلیں، پیسے کا ڈوبنا، باپ کی خاموشی، اور پھر... دادی کا بچھڑ جانا۔ وہ بولتا رہا، اور روتا رہا، اور مولانا ہاشم، ایک ہمدرد دوست کی طرح، خاموشی سے، بغیر ٹوکے، اس کی ہر بات سنتے رہے۔

جب وہ اپنی پوری داستان سنا چکا، تو اسے لگا جیسے اس کے سینے پر سے ایک پہاڑ ہٹ گیا ہو۔

، مولانا ہاشم نے ایک گہرا سانس لیا، اور بولے

سمیر بیٹا، اللہ جب کسی سے محبت کرتا ہے، تو اسے دنیا کی حقیقت دکھا دیتا ہے۔ وہ اس سے دنیا کی ہر جھوٹی محبت، ہر جھوٹا سہارا چھین لیتا ہے، تاکہ بندہ صرف اور صرف، اسی کی" "طرف دیکھے۔

تمہارا پیسہ ڈوبا... تمہارے دوستوں نے چھوڑا... یہاں تک کہ تمہاری سب سے عزیز ہستی، تمہاری دادی بھی تم سے لے لی گئیں... یہ سب اس لیے ہوا، کیونکہ تمہارا رب" "تمہیں، اپنی طرف، مکمل طور پر بلانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں، اس کے سوا، کسی اور کی محبت کا ایک ذرہ بھی باقی رہے۔

"اس نے تمہیں توڑا... تاکہ وہ تمہیں، پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت، اور زیادہ مضبوط، بنا سکے۔"

یہ باتیں، سمیر کے دل پر مرہم کی طرح لگ رہی تھیں۔ اسے پہلی بار، اپنی بربادی میں، اپنے رب کی کوئی حکمت، کوئی منصوبہ نظر آ رہا تھا۔

"اب مجھے کیا کرنا ہو گا، حضرت؟"

سمیر نے بے بسی سے پوچھا۔

"میرا کچھ نہیں بچا... میں اپنے باپ کا سامنا کیسے کروں؟ لوگوں کا قرض کیسے اتاروں؟"

،مولانا ہاشم مسکرائے

"جس نے راستہ دکھایا ہے، وہی منزل بھی دکھائے گا۔ جس نے تمہیں اپنے گھر بلایا ہے، وہی تمہارے سارے معاملے بھی سلجھائے گا۔"

"،تم بس ایک کام کرو"

انہوں نے کہا۔

"اپنے رب سے دوستی کر لو۔"

"دوستی؟"

سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، دوستی۔"

مولانا نے وضاحت کی۔

اس سے باتیں کرو، جیسے تم مجھ سے کر رہے ہو۔ اسے اپنے دکھ سناؤ، اپنی پریشانیاں بتاؤ۔ اس سے مانگو... گڑ گڑا کر مانگو۔ رات کی تنہائی میں، جب سارا عالم سو رہا ہو، تو اس کے " سامنے کھڑے ہو جاؤ، اور اس سے کہو، 'اے میرے دوست! اے میرے رب! میں کمزور ہوں، تو طاقت والا ہے۔ میں خالی ہاتھ ہوں، تیرے خزانے بھرے ہیں۔ میری مدد "کر'۔

"وہ سنے گا... وہ ضرور سنے گا۔ وہ تو بس اپنے بندے کی پکار کا منتظر ہوتا ہے۔"

اس دن، سمیر کو صرف ایک امام نہیں، ایک رہبر، ایک دوست، ایک روحانی باپ مل گیا تھا۔ اس کی بھٹکی ہوئی کشتی کو، ایک مضبوط لنگر مل گیا تھا۔

اس نے مولانا ہاشم کے ہاتھ چوم لیے، اور وعدہ کیا کہ وہ ان کی ہر بات پر عمل کرے گا۔

جب وہ مسجد سے نکلا، تو سورج کی پہلی کرنیں، گاؤں پر پڑ رہی تھیں، اور ایک نئی، پر امید صبح کا آغاز ہو رہا تھا۔

اس کے دل میں اب بھی درد تھا، پچھتاوا تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ، ایک ننھی سی، ٹمٹماتی ہوئی، امید کی شمع بھی روشن ہو چکی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ آگے کا سفر کتنا کٹھن ہے، مگر اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس نے اپنے سب سے بڑے، اور سب سے سچے دوست کا ہاتھ... تھام لیا تھا۔

حصہ پنجم: قلب کا سفر

باب15: آنسوؤں سے وضو

مولانا ہاشم کے الفاظ، ایک بیج کی طرح، سمیر کے دل کی زمین میں بو دیے گئے تھے۔ اب اس زمین کو سیراب کرنے کی، اور اس بیج کو ایک تناور درخت بنانے کی ذمہ داری، خود سمیر کی تھی۔

اس کی زندگی کا معمول بدل گیا۔ وہ اب راتوں کو بے چینی اور وحشت سے کروٹیں نہیں بدلتا تھا۔ اب اسے رات کی تنہائی کا انتظار رہتا تھا۔ وہ انتظار، جو ایک عاشق، اپنے محبوب سے ملاقات کے لیے کرتا ہے۔

، اس کی رات کا آغاز، عشاء کی نماز کے بعد ہی ہو جاتا۔ جب اس کا باپ، اپنی خاموش دنیا میں گم، سو جاتا، تو سمیر چپکے سے اٹھتا۔ وہ دادی اماں کے کمرے میں جاتا، اور ان کا وہ پرانا بوسیدہ جائے نماز بچھاتا۔

یہ وہی جائے نماز تھا، جسے دیکھ کر کبھی اس کی روح کانپ جاتی تھی۔ آج یہی جائے نماز، اس کی معراج گاہ، اس کی پناہ گاہ تھی۔

وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا، مگر یہ وہ نماز نہیں تھی، جو اس نے بچپن میں سیکھی تھی۔ یہ ایک عاشق کی، اپنے محبوب کے حضور، حاضری تھی۔

اس کے "اللہ اکبر" میں، دنیا کی ہر شے کو اپنے پیچھے پھینک دینے کا عزم ہوتا۔
اس کی "الحمدللہ" میں، ان گنت نعمتوں کا شکر ہوتا، جو اس نے کبھی گنی ہی نہیں تھیں۔
"اس کے "ایاک نعبد وایاک نستعین" میں، ایک مکمل سپردگی ہوتی، کہ "میں صرف تیرا ہوں، اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔

مگر جب رات کا سناٹا اور گہرا ہو جاتا، جب آدھی دنیا نیند کے بستر پر، غفلت کے خواب دیکھ رہی ہوتی، تو سمیر اٹھتا... اس نماز کے لیے، جو مومن کی معراج کہلاتی ہے، جو عاشقوں کی خلوت گاہ ہوتی ہے۔

...تہجد

وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا، اور ہر قطرے کے ساتھ، اسے محسوس ہوتا کہ اس کا کوئی گناہ، اس کی کوئی خطا، دھل رہی ہے۔

پھر وہ جائے نماز پر کھڑا ہوتا۔ اس کے اور اس کے رب کے درمیان، اب کوئی پردہ، کوئی تیسرا وجود نہیں ہوتا تھا۔

وہ قرآن کی وہ سورتیں پڑھتا، جو اسے ٹوٹی پھوٹی یاد تھیں، مگر ہر حرف، اس کے دل پر ایک نئی معانی کے ساتھ اترتا۔

...اور پھر، جب وہ سجدے میں جاتا

وہ سجدہ، زمین و آسمان کا فرق مٹا دیتا۔

وہ اپنا سر، زمین کی سب سے پست سطح پر رکھتا، اور اس کی روح، آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے لگتی۔

وہاں، اس سجدے میں، وہ بولتا... اور اس کا رب سنتا۔

وہ روتا... اور اس کا رب، اس کے آنسوؤں کو اپنے رحمت کے دامن میں سمیٹ لیتا۔

یہ آنسو... ندامت کے ہوتے۔

"...اے اللہ! میں نے کیا کیا... میں نے تیری دی ہوئی زندگی، تیری دی ہوئی جوانی، کیسے برباد کر دی... مجھے معاف کر دے"

یہ آنسو... شکر کے ہوتے۔

"...اے اللہ! تیرا شکر ہے... کہ تو نے مجھے، اس گندگی سے نکال لیا... تو نے مجھے، اپنے در پر واپس بلا لیا... ورنہ میرا ٹھکانہ تو جہنم تھا"

یہ آنسو... التجا کے ہوتے۔

"...اے میرے مولا! میں کمزور ہوں... میں بے بس ہوں... میرے باپ کے دل کو نرم کر دے... مجھے لوگوں کا قرض اتارنے کی ہمت دے... مجھے سیدھا راستہ دکھا"

وہ روتا جاتا، بولتا جاتا، مانگتا جاتا... یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں، اور اس کی آواز، اس کے حلق میں گھٹ کر رہ جاتی۔

یہ آنسو، اس کا وضو تھے۔ ایک ایسا وضو، جو اس کے دل پر لگے ہر زنگ کو، ہر داغ کو، دھو رہا تھا۔

انہی راتوں میں، اسے اپنی دادی کی قدر معلوم ہوئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بزرگ ہستی، ہر رات، اسی طرح، اپنے رب سے، اس کی سلامتی کے لیے، اس کی ہدایت کے لیے، راز و نیاز کرتی ہوں گی۔ اور آج، ان کی دعاؤں کا ہی ثمر تھا، کہ وہ، سمیر، اس مقام پر کھڑا تھا۔

انہی راتوں میں، اسے اپنے باپ کی خاموشی کا مطلب سمجھ آیا۔ یہ غصے کی خاموشی نہیں تھی، یہ ٹوٹے ہوئے اعتبار، اور بکھرے ہوئے خوابوں کی خاموشی تھی۔

یہ رات کی تنہائی کی عبادتیں، یہ آنسوؤں سے کیا گیا وضو، سمیر کو اندر سے بدل رہا تھا۔ یہ اس کے کردار کی تعمیرِ نو تھی۔ یہ اس کے دل کی زمین پر، تقویٰ، صبر اور شکر کے بیج بو رہا تھا۔

وہ ایک نیا سمیر بن رہا تھا۔ ایک ایسا سمیر، جو دنیا کی نظروں میں "ہارا" ہوا تھا، مگر اپنے رب کی نظر میں، اب "مقبول" ہونے جا رہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی دعائیں کب قبول ہوں گی، یا اس کی مشکلیں کب ختم ہوں گی۔

مگر اب اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

اس نے سکون، منزل میں نہیں، بلکہ اس سفر میں ہی پا لیا تھا۔ اپنے رب سے، رات کی تنہائی میں، آنسوؤں کے ساتھ راز و نیاز کرنے کا یہ سفر... خود ہی ایک منزل تھی۔

باب16: بدلا ہوا انسان

تہجد کے سجدوں میں بہائے گئے آنسو، صرف رات کی تاریکی میں گم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ سمیر کی شخصیت پر، اس کے کردار پر، اس کے ہر عمل پر، ایک انمٹ نقش چھوڑ رہے تھے۔ وہ اب صرف رات کا عابد نہیں، بلکہ دن کا ایک بدلا ہوا انسان بنتا جا رہا تھا۔

اس تبدیلی کا سب سے پہلا، اور سب سے مشکل امتحان، اس کے اپنے گھر میں تھا۔

ایک صبح، جب اس کا باپ، ہمیشہ کی طرح، خاموشی سے ناشتہ کر رہا تھا، سمیر ہمت کر کے، ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی، کوئی صفائی نہیں دی، صرف ان کے پاؤں پکڑ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"...ابا... مجھے معاف کر دیں... میں آپ کا مجرم ہوں... میں نے آپ کا سر جھکا دیا... میں آپ کے اعتبار کے لائق نہیں تھا"

اس کا باپ، جو ایک پتھر کا مجسمہ بنا ہوا تھا، اس کے آنسوؤں کی گرمی سے پگھلنے لگا۔ سالوں بعد، اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا، اور اپنے بیٹے کے سر پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی۔

"اٹھ جا بیٹا..." ان کی آواز، جو ایک عرصے سے خاموش تھی، آج بھرا گئی۔ "جو لوٹ آئے، اسے مجرم نہیں کہتے۔"

یہ چند الفاظ، سمیر کے لیے، دنیا کی سب سے بڑی عدالت سے بریت کا پروانہ تھے۔ اس دن، باپ بیٹے کے درمیان کھڑی، شیشے کی وہ دیوار، ریزہ ریزہ ہو گئی۔

اس کے بعد، سمیر نے بھاگنے یا چھپنے کی بجائے، ذمہ داریوں کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پر گاؤں کے لوگوں کا قرض ہے۔ وہ ایک ایک کر کے، ان تمام لوگوں کے گھر گیا، جن سے اس نے پیسے لیے تھے۔

،وہ ان کے سامنے کھڑا ہوتا، نظریں جھکائے، اور کہتا

میں جانتا ہوں، میں نے آپ کا اعتبار توڑا ہے۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں۔ میرے پاس ابھی آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے... مگر میں آپ سے بھاگوں گا نہیں۔ میں محنت"
"کروں گا، مزدوری کروں گا، اور آپ کی پائی پائی، سود کے بغیر، آپ کو لوٹاؤں گا۔ بس مجھے تھوڑی مہلت دے دیں۔

کچھ لوگوں نے اسے برا بھلا کہا، کچھ نے طعنے دیے، مگر اس کی سچی ندامت اور اس کی آنکھوں کی سچائی دیکھ کر، زیادہ تر لوگوں نے اسے مہلت دے دی۔

اب وہ "شہری بابو" نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں میں، کسی بھی کام کو کرنے میں عار محسوس نہیں کی۔ وہ کھیتوں میں مزدوری کرتا، منڈی میں بوریاں اٹھاتا، جو بھی کام ملتا، وہ سر جھکا کر کرتا۔ سارا دن کی سخت محنت کے بعد، جب اسے چند سو روپے ملتے، تو اسے ان چند سو روپوں میں، شہر کے لاکھوں روپوں سے زیادہ سکون اور برکت محسوس ہوتی۔

اس کی زندگی کا محور بدل چکا تھا۔ پہلے اس کی ہر سوچ، اپنی ذات، اپنی خواہش، اپنی خوشی کے گرد گھومتی تھی۔ اب اس کی زندگی میں، دوسروں کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

وہ دیکھتا کہ گاؤں کی کوئی بیوہ بیمار ہے، تو اپنی تھوڑی سی کمائی سے اس کے لیے دوا لے آتا۔ وہ دیکھتا کہ کسی غریب کے بچے کے پاس کتابیں نہیں ہیں، تو اس کے لیے کتابوں کا بندوبست کر دیتا۔

یہ چھوٹے چھوٹے عمل، اسے ایک ایسی روحانی خوشی دیتے، جو اسے دنیا کی کسی محفل میں نہیں ملی تھی۔

گاؤں کے وہی لوگ، جو کل تک اسے حقارت سے دیکھتے تھے، اب اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

مسجد کے امام، مولانا ہاشم، اسے دیکھ کر مسکراتے، اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے۔

اس کا سب سے بڑا سہارا، مولانا ہاشم کی صحبت تھی۔ وہ ہر نماز کے بعد، ان کے پاس بیٹھتا، ان سے دین سیکھتا، اور اپنی روحانی الجھنوں پر بات کرتا۔

،ایک دن، اس نے مولانا ہاشم سے پوچھا

"حضرت، میں نے اپنی زندگی کے دو قیمتی سال، گناہوں میں برباد کر دیے۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔"

،مولانا ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا

بیٹا، کبھی کبھی، منزل تک پہنچنے کے لیے، بھٹکنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر تم ان اندھیروں سے نہ گزرتے، تو تمہیں روشنی کی قدر کیسے معلوم ہوتی؟ اگر تم پیاسے نہ رہتے، تو" "تمہیں پانی کی مٹھاس کا احساس کیسے ہوتا؟

تمہارے وہ دو سال ضائع نہیں ہوئے... وہ تمہاری تربیت کا حصہ تھے۔ اللہ نے تمہیں پستی دکھائی، تاکہ وہ تمہیں بلندی عطا کر سکے۔ اس نے تمہیں خالی ہاتھ کیا، تاکہ وہ تمہارے" "ہاتھ، اپنی نعمتوں سے بھر سکے۔

یہ الفاظ، سمیر کے دل میں اتر گئے۔ اس کا افسوس، ایک گہرے سکون اور شکر میں بدل گیا۔

وہ اب ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ اس کے چہرے پر، اب شہر کی مصنوعی چمک نہیں، بلکہ سجدوں کا ایک حقیقی نور تھا۔ اس کی باتوں میں، اب غرور اور تکبر نہیں، بلکہ عاجزی اور حکمت تھی۔

اس کی زندگی میں، اب بے مقصدیت اور شور نہیں، بلکہ ایک واضح مقصد، اور ایک گہرا، پر سکون ٹھہراؤ تھا۔

...وہ دنیا کی نظر میں، ایک ناکام، غریب مزدور تھا

مگر حقیقت میں، وہ ایک ایسا بادشاہ تھا، جسے "سکونِ قلب" کی سلطنت مل چکی تھی۔

باب17: قرآن سے گفتگو

سمیر کی زندگی اب ایک نئے، پر سکون دھارے میں بہہ رہی تھی۔ دن کی سخت محنت، رات کی پر سکون عبادت، باپ کی بڑھتی ہوئی شفقت اور مولانا ہاشم کی رہنمائی... اس کی دنیا مکمل ہو چکی تھی۔ مگر اس کی روح، اب بھی ایک اور گہری پیاس محسوس کرتی تھی۔ ایک ایسی پیاس، جو صرف سجدوں اور دعاؤں سے نہیں بجھ رہی تھی۔

وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تھا، اس سے باتیں کرتا تھا، روتا تھا، مانگتا تھا... مگر وہ اپنے رب کو "سننا" بھی چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا رب، اس سے کیا چاہتا ہے؟ وہ اس سے کیا کہتا ہے؟

ایک دن، اس نے یہی سوال، مولانا ہاشم کے سامنے رکھا۔

"حضرت، میں اللہ سے بات تو کرتا ہوں، مگر میں اسے سنوں کیسے؟ میں کیسے جانوں کہ وہ مجھ سے کیا کہہ رہا ہے؟"

مولانا ہاشم کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔ انہوں نے مسجد کے کونے میں رکھی رحل کی طرف اشارہ کیا، جس پر قرآن مجید رکھا تھا۔

وہ دیکھو..." انہوں نے کہا۔"

"وہ تمہارے رب کا خط ہے، جو اس نے تمہارے نام لکھا ہے۔ تم اسے پڑھو، تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ وہ تم سے اسی کے ذریعے ہمکلام ہوتا ہے۔"

"یہ بات، سمیر کے دل پر ایک بجلی کی طرح گری۔ "اللہ کا خط... میرے نام؟

اس دن سے، اس کی زندگی کا ایک نیا، اور سب سے خوبصورت باب شروع ہوا۔

وہ چونکہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، اور بچپن میں سیکھا ہوا قرآن بھی بھول چکا تھا، اس لیے اس نے ایک چھوٹے بچے کی طرح، دوبارہ "قاعدہ" سے آغاز کیا۔ وہ ہر روز، فجر کی نماز کے بعد، مولانا ہاشم کے پاس بیٹھتا، اور ان سے ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ سیکھتا۔

اس کے لیے یہ آسان نہیں تھا۔ دن بھر کی مشقت کے بعد، اس کا تھکا ہوا جسم، آرام مانگتا، مگر اس کے اندر کی لگن، اسے ہر روز، اس پاک کلام کے سامنے لا بٹھاتی۔

مہینے گزر گئے۔ آہستہ آہستہ، وہ قرآن کو، ہجوں کے ساتھ، اٹک اٹک کر، پڑھنے کے قابل ہو گیا۔

پھر مولانا ہاشم نے اسے، قرآن کا ترجمہ اور مختصر تفسیر پڑھانا شروع کی۔

اور یہاں سے... اس کی دنیا ہی بدل گئی۔

اب وہ قرآن کو صرف پڑھ نہیں رہا تھا، وہ اسے "جی" رہا تھا۔ ہر آیت، اسے لگتا، جیسے خاص اسی کے لیے اتری ہے۔

جب وہ پڑھتا: **"اور جب میرے بندے، میرے بارے میں آپ سے سوال کریں، تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کو، جب بھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں۔"**

تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ اسے اپنی وہ راتیں یاد آ جاتیں، جب وہ تنہائی میں، اپنے رب کو پکارتا تھا، اور اسے لگتا کہ اس کی ہر پکار، عرش تک پہنچ رہی ہے۔

"جب وہ پڑھتا: **"بے شک، مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔**

تو اسے اپنی زندگی کے وہ کٹھن دن یاد آتے، جب وہ بالکل ٹوٹ چکا تھا، اور پھر کیسے، اللہ نے اس کے لیے، آسانی کے دروازے کھول دیے۔ اس کا دل، شکر سے بھر جاتا۔

"جب وہ پڑھتا: **"اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے، تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔**

تو اس کا ایمان، اور بھی پختہ ہو جاتا۔ اسے یقین ہو جاتا کہ اس کے قرض، اس کی پریشانیاں، سب دور ہو جائیں گی، کیونکہ اس کا بھروسہ، اب کسی انسان پر نہیں، بلکہ کائنات کے خالق پر ہے۔

وہ قرآن کو ایک کتاب کی طرح نہیں پڑھتا تھا۔ وہ اس سے گفتگو کرتا تھا۔

، وہ ایک آیت پڑھتا، پھر آنکھیں بند کر کے، اس پر غور کرتا، اور اپنے دل میں کہتا

"اے میرے رب! تو سچا ہے۔ تو نے بالکل سچ کہا۔ میری زندگی، اس آیت کی گواہ ہے۔"

اسے لگتا، جیسے وہ ایک گہرے، ٹھنڈے، میٹھے چشمے سے، اپنی پیاسی روح کو سیراب کر رہا ہے۔

اسے اپنے ہر سوال کا جواب، قرآن میں مل رہا تھا۔

اسے اپنے ہر درد کا مرہم، قرآن میں مل رہا تھا۔

اسے اپنی ہر الجھن کا حل، قرآن میں مل رہا تھا۔

اس نے جانا کہ زندگی کا مقصد، صرف نماز پڑھنا اور روزے رکھنا نہیں، بلکہ اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق، ایک پاکیزہ، منصفانہ اور ہمدردانہ زندگی گزارنا ہے۔

اس نے جانا کہ اصل کامیابی، پیسے یا شہرت میں نہیں، بلکہ "تقویٰ" میں ہے، دل کے اس ڈر میں ہے، جو انسان کو گناہ سے روکے۔

.قرآن، اس کا دوست بن گیا، اس کا رہنما بن گیا، اس کا ساتھی بن گیا

وہ اب ایک ایسا مسافر تھا، جس کے ہاتھ میں، منزل کا نقشہ آ گیا تھا۔ ایک ایسا نقشہ، جو کبھی پرانا نہیں ہوتا، اور جو کبھی غلط راستہ نہیں دکھاتا۔

اس کی روح، اب صرف سیراب نہیں ہوئی تھی... وہ خود ایک چشمہ بننے لگی تھی، جس سے آگے چل کر، اور بھی پیاسی روحوں کو سیراب ہونا تھا۔

حصہ ششم: روشنی کا مینار

باب18: سکونِ قلب

وقت گزرتا گیا، اور قرآن کی روشنی، سمیر کے پورے وجود کو منور کرتی چلی گئی۔ اس کا دل، جو کبھی خواہشات، حسد اور غرور کا مسکن تھا، اب اللہ کی محبت، اس کے ذکر اور اس کے شکر سے لبریز ہو چکا تھا۔

اس کی زندگی میں اب بھی چیلنجز تھے۔ اس پر اب بھی قرض کا بوجھ تھا، اور اس کے باپ کی آنکھوں میں اب بھی کبھی کبھار ایک اداس سی جھلک نظر آجاتی تھی۔ مگر اب، ان مشکلات کا سامنا کرنے کا اس کا انداز بدل چکا تھا۔

وہ اب پریشان نہیں ہوتا تھا، بلکہ دعا کرتا تھا۔

وہ اب گھبراتا نہیں تھا، بلکہ صبر کرتا تھا۔

وہ اب شکوہ نہیں کرتا تھا، بلکہ شکر کرتا تھا۔

اس نے جان لیا تھا کہ یہ دنیا، ایک امتحان گاہ ہے، اور یہ مشکلات، اس کے درجات بلند کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اس نے سخت محنت جاری رکھی۔ اس کی ایمانداری اور دیانتداری کی وجہ سے، لوگ اس پر اعتبار کرنے لگے۔ گاؤں میں ہی اسے ایک چھوٹی سی دکان پر کام مل گیا، اور اس کی تھوڑی بہت مستقل آمدنی شروع ہو گئی۔ وہ اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ، قرض اتارنے کے لیے الگ رکھتا، اور جو بچتا، اسی میں سادگی سے اپنے اور اپنے باپ کے ساتھ گزارا کرتا۔

اس کی زندگی میں اب کوئی "بلومسٹ" کیفے کا دھواں نہیں تھا، مگر اسے چائے کے ایک کپ میں، اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ کر، اس سے زیادہ لطف آتا تھا۔
اس کی زندگی میں اب کوئی تیز موسیقی نہیں تھی، مگر اسے پرندوں کی چہچہاہٹ اور اذان کی آواز، دنیا کے ہر ساز سے زیادہ مدھر لگتی تھی۔
اس کی زندگی میں اب سینکڑوں جھوٹے دوست نہیں تھے، مگر مولانا ہاشم کی صحبت، اور گاؤں کے چند مخلص لوگوں کا ساتھ، اسے کائنات کی سب سے بڑی دولت محسوس ہوتا تھا۔

اسے حقیقی "سکونِ قلب" مل چکا تھا۔

ایک ایسی اندرونی کیفیت، جسے نہ دولت خرید سکتی ہے، نہ شہرت دلا سکتی ہے۔

ایک ایسا اطمینان، جو باہر کے حالات کا محتاج نہیں ہوتا۔

ایک ایسی خوشی، جو سیدھا روح سے پھوٹتی ہے۔

وہ جان گیا تھا کہ اصل امیری، پیسے کی کثرت کا نام نہیں، بلکہ دل کے غنی ہونے کا نام ہے۔

وہ جان گیا تھا کہ اصل کامیابی، دنیا کی نظر میں بڑا بننا نہیں، بلکہ اپنے رب کی نظر میں مقبول ہو جانا ہے۔

،ایک شام، جب وہ کام سے تھکا ہارا گھر لوٹا، تو اس نے دیکھا کہ اس کا باپ، صحن میں بیٹھا، بہت غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آج، وہ پرانی تھکاوٹ اور اداسی نہیں بلکہ ایک فخر، ایک چمک تھی۔

سمیر بیٹا..." انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا۔"

"...جی ابا"

"مجھے تم پر فخر ہے۔"

یہ تین الفاظ... یہ تین الفاظ، سمیر کے لیے، دنیا کی ہر ڈگری، ہر ایوارڈ، ہر کامیابی سے بڑھ کر تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آگے بڑھا اور اپنے باپ کے سینے سے لگ گیا۔ آج، سالوں بعد، اس کے باپ نے بھی، اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

اس دن، سمیر کو لگا کہ اس کا سفر، اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

اسے اپنا کھویا ہوا سب کچھ واپس مل گیا تھا- اپنے باپ کا اعتبار، گاؤں والوں کی عزت، اور سب سے بڑھ کر، اپنے دل کا سکون۔

مگر کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔

کیونکہ جو چراغ، خود روشن ہو جاتا ہے، اس کی روشنی صرف اس تک محدود نہیں رہتی۔ وہ اپنے ارد گرد کے اندھیروں کو بھی مٹانے لگتا ہے۔

سمیر کی یہ تبدیلی، اس کے گاؤں کے دوسرے نوجوانوں کے لیے، ایک خاموش پیغام بن گئی۔ وہ نوجوان، جو شہروں کی چکاچوند سے متاثر تھے، اب سمیر کو دیکھتے تھے- ایک ایسا شخص، جو شہر کے سب سے گہرے اندھیروں سے ہو کر لوٹا تھا، مگر اس کے چہرے پر، دنیا کے ہر کامیاب انسان سے زیادہ نور اور سکون تھا۔

وہ اب ایک بدلا ہوا انسان نہیں رہا تھا... وہ اب خود، دوسروں کے لیے، ایک "روشنی کا مینار" بننے جا رہا تھا۔

باب 19: روشنی کا مینار

جو دیا خود جل اٹھتا ہے، اس کی فطرت میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد بھی روشنی بکھیرے۔ سمیر کی زندگی، اب اسی روشن دیے کی مانند تھی۔

اس کی تبدیلی، اتنی گہری اور سچی تھی کہ وہ گاؤں میں ایک چلتی پھرتی مثال بن گیا۔

پہلے، گاؤں کے نوجوان، جو شہر جانے کے خواب دیکھتے تھے، اسے ایک "ہارے ہوئے" شخص کے طور پر دیکھتے تھے۔ مگر جب انہوں نے اس کی محنت، اس کی ایمانداری، اس کے چہرے کا اطمینان، اور اس کے اپنے باپ کے ساتھ گہرے ہوتے ہوئے رشتے کو دیکھا، تو ان کے خیالات بدلنے لگے۔

وہ دیکھتے کہ سمیر، دن بھر کی سخت مشقت کے بعد بھی، تھکن کا شکوہ کیے بغیر، مسکراتے ہوئے مسجد کی طرف جاتا ہے۔ وہ دیکھتے کہ وہ اپنی قلیل آمدنی میں سے بھی، کسی نہ کسی ضرورت مند کی مدد ضرور کرتا ہے۔ وہ سنتے کہ اس کی زبان سے، اب طعنہ یا غیبت نہیں، بلکہ حکمت اور شکر کے کلمات نکلتے ہیں۔

یہ سب ان کے لیے ایک خاموش دعوت تھی۔

ایک دن، چند نوجوان، جو شہر جانے کی تیاری کر رہے تھے، جھجکتے ہوئے اس کے پاس آئے۔

، سمیر بھائی، "ان میں سے ایک نے پوچھا"

"ہم نے سنا ہے، شہر میں بہت ترقی ہے، ، بہت پیسہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

سمیر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے، 'بلومسٹ' کیفے کا دھواں، دوستوں کے جھوٹے قہقہے، اور پارک کے بینچ پر گزری وہ قیامت کی رات گھوم گئی۔

، پھر اس نے مسکرا کر ان نوجوانوں کو دیکھا، اور کہا

"ہاں، شہر میں بہت کچھ ہے۔ بلند عمارتیں ہیں، تیز رفتار گاڑیاں ہیں، چکاچوند روشنیاں ہیں۔ مگر ایک چیز ہے، جو وہاں بہت مشکل سے ملتی ہے۔"

وہ کیا؟" نوجوانوں نے بے تابی سے پوچھا۔"

سکون۔" سمیر نے جواب دیا۔"

"دل کا سکون۔"

پھر اس نے ان کو اپنے پاس بٹھایا، اور پہلی بار، اپنی پوری کہانی، بغیر کچھ چھپائے، انہیں سنا دی۔ اپنا بھٹکنا، اپنا ٹوٹنا، اور پھر... اپنے رب کی رحمت سے، اپنا جڑنا۔

اس کی کہانی میں کوئی فلسفہ نہیں تھا، کوئی بھاری بھرکم الفاظ نہیں تھے۔ اس میں ایک سچے تجربے کا درد، اور ایک حقیقی ندامت کی سچائی تھی۔

، اس نے آخر میں کہا

میں یہ نہیں کہتا کہ شہر نہ جاؤ، یا ترقی نہ کرو۔ ضرور کرو۔ مگر اپنی جڑوں کو، اپنی قدروں کو، اور اپنے رب کو کبھی مت بھولنا۔ کیونکہ اگر تم نے اسے کھو دیا، تو تم دنیا کی ہر شے پا کر" "بھی، ہمیشہ خالی ہاتھ رہو گے۔

اس دن، اس کی کہانی نے ان نوجوانوں کے دل پر وہ اثر کیا، جو کوئی کتاب یا کوئی تقریر نہ کر سکتی تھی۔

آہستہ آہستہ، سمیر، گاؤں کے نوجوانوں کے لیے، ایک دوست، ایک بھائی، اور ایک رہنما بن گیا۔

وہ مسجد میں، مولانا ہاشم کی اجازت سے، ایک چھوٹی سی محفل منعقد کرنے لگا، جہاں وہ نوجوانوں کو، قرآن کی وہ باتیں، اسی سادہ اور محبت بھرے انداز میں سکھاتا، جو اس نے خود سیکھی تھیں۔

وہ انہیں صرف دین نہیں سکھاتا تھا، وہ انہیں زندگی سکھاتا تھا۔ وہ انہیں بتاتا کہ ایمانداری میں کتنی برکت ہے، محنت میں کتنی عظمت ہے، اور دوسروں کی خدمت میں کتنی خوشی ہے۔

سال گزرتے گئے۔

سمیر نے محنت کر کے، اپنا سارا قرض اتار دیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی دکان کو بڑھایا، اور گاؤں کے چند اور بے روزگار نوجوانوں کو بھی اپنے ساتھ کام پر رکھ لیا۔ اس کا باپ، اب ایک خوش اور فخر سے سر اٹھا کر جینے والا بزرگ تھا، جس کی ہر دعا اپنے بیٹے کے لیے تھی۔

وہ اب بھی ایک عام سا، سادہ سا انسان تھا... مگر اس کی سادگی میں، ایک غیر معمولی تاثیر تھی۔
اس کے پاس دنیا کی دولت نہیں تھی... مگر اس کا دل، کائنات کے ہر خزانے سے زیادہ غنی تھا۔

وہ ایک مینار کی طرح تھا... ایک "روشنی کا مینار"... جو خود طوفانوں سے گزر کر، اب دوسرے بھٹکے ہوئے جہازوں کو، سکون کے ساحل کا راستہ دکھا رہا تھا۔

کرن بن چکا تھا۔ ahiاس کا سفر، اندھیروں سے شروع ہوا تھا، مگر اس کا انجام، ان گنت لوگوں کے لیے، نور کی ایک لا متنا

اس نے جان لیا تھا کہ زندگی کا اصل مقصد، صرف اپنی منزل پا لینا نہیں... بلکہ خود ایک ایسا راستہ بن جانا ہے، جس پر چل کر، اور بھی کئی پیاسے، اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔

(اختتام)

مصنف کے بارے میں



انیم چودھری ایک حساس دل اور گہری روحانی بصیرت رکھنے والے لکھاری ہیں۔ ان کی تحریروں میں انسانی نفسیات، سماجی حقیقتوں اور روحانیت کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ "اندھیروں سے نور تک کا سفر" ان کا پہلا ناول ہے، جو ان کی اس قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ کس طرح الفاظ کے ذریعے روح کے گہرے ترین زخموں کو چھو کر، امید کا مرہم رکھنے کا ہنر جانتے ہیں